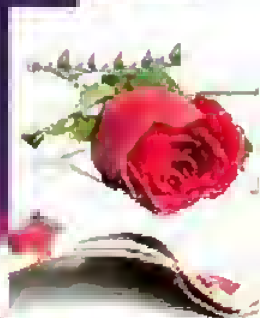


احمد نغم قاسمی

دور



ترسیب

انتساب

- ۱۔ دعا ، ۱۳
- ۲۔ نعت دل میں اترتے حرف سے مجھ کو ملا پتہ ترا ، ۱۵
- ۳۔ غزل مددِ راکِ نیا سورج ہے تری عطاؤں میں ، ۱۶
- ۴۔ بزمِ سفر ، ۲۰
- ۵۔ ہنستے نکلتے ، ۲۱
- ۶۔ چاند ، ۲۲
- ۷۔ منفیت کا ششور ، ۲۳
- ۸۔ فشار ، ۲۴
- ۹۔ قبر پر پھولی ، ۲۸
- ۱۰۔ کون گیا کون آیا ، ۲۹
- ۱۱۔ پت جھڑکی تنہائی ، ۳۰
- ۱۲۔ خواب ، ۳۱
- ۱۳۔ غزل ، ہم کبھی عشق کو دشت نہیں بنے دیتے ، ۳۲
- ۱۴۔ رہنما ، ۳۳
- ۱۵۔ غزل ، جہاں فن کا، ترسے اور میرے گھر میں رہا ، ۳۵
- ۱۶۔ ترقی یافتہ ، ۳۶
- ۱۷۔ غزل اب ترسے رخ پر محبت کی شفق چھولی تو کیا ، ۳۸

- ۱۸۔۔۔ جبر ، ۳۰
۱۹۔۔۔ غزل کا ایک لمحہ ، ۱۳
۲۰۔۔۔ غزل آئے ، کوئی انقلاب آئے ، ۴۲
۲۱۔۔۔ قربِ جنت ، ۳۴
۲۲۔۔۔ غزل یوں تو میں دشت پہی پر تو گمشدہ کیوں ، ۴۵
۲۳۔۔۔ روح و بدن کے تودہ ج ، ۳۴
۲۴۔۔۔ غزل وہ جو اک لمحہ سے مصروف عبادت میں تھے ، ۳۸
۲۵۔۔۔ نئی تعبیر ، ۵۰
۲۶۔۔۔ غزل اہل ثروت پہ غلامی پہ بھگت دے دی ، ۵۲
۲۷۔۔۔ غزل بادِ ہمارے بھی چلتے تھے آگے کی طرف ، ۵۳
۲۸۔۔۔ غزل سر سے دروڑ نہیں ، رنگ سے سر در نہیں ، ۵۷
۲۹۔۔۔ انصاف ، ۵۸
۳۰۔۔۔ گناہ و ثواب ، ۵۹
۳۱۔۔۔ صحنِ آسائش ، ۶۰
۳۲۔۔۔ آئے وہ اپنے نظروں کی نگار ، ۶۱
۳۳۔۔۔ بھلا ، ۶۵
۳۴۔۔۔ شبِ معصوم ، ۶۶
۳۵۔۔۔ جذب ، ۶۷
۳۶۔۔۔ غزل بکھرے ہاؤں کا ایک اجڑا ہاؤں گا میں ، ۶۸
۳۷۔۔۔ غزل ہو لوگ دشمنی جاں تھے ، دی سارے تھے ، ۷۰
۳۸۔۔۔ آشوب ، ۷۲
۳۹۔۔۔ غزل مرکزِ حق میں گونگے تھے ، ۷۶
۴۰۔۔۔ اضافی ، ۷۸
۴۱۔۔۔ عقل اور دم ، ۷۹
۴۲۔۔۔ غزل جانے بہت کچھ ہے اتر چکا کئی کئی کچھ کچھ گئی ، ۸۰
۴۳۔۔۔ مصلحت و نفی ، ۸۲
۴۴۔۔۔ ذرا آسانی تک ، ۸۴
۴۵۔۔۔ غزل یہ براغ یا قیامت کی گھڑی ہے ، ۸۶
۴۶۔۔۔ غزل تر وہ ہیں ہے فرسبِ عشق کا ، نہ وہ دی میں کشتِ جہاں کے ، ۸۸
۴۷۔۔۔ غزل گویا مجھ سے نوب بھی اچھی آرائی ، ۹۰
۴۸۔۔۔ غزل سطر کردی کا پرانہ سرویں اکبر کیسے ، ۹۲
۴۹۔۔۔ غزل جب اس کے وجود پر فکر کی ، ۹۵
۵۰۔۔۔ قوی بھی مجھ چیز ہے ، ۹۷
۵۱۔۔۔ برفِ جب بھیگی ، ۹۸
۵۲۔۔۔ غزل مجھ پر شاہ میں جب کچھ گئی شمع کی فتو ، ۹۹
۵۳۔۔۔ آئے وہاں زمانہ ، ۱۰۱
۵۴۔۔۔ ابھی چاند نکلا جس سے ، ۱۰۲
۵۵۔۔۔ غزل یہ کیا کوشش کروں ، پاؤں آبرو نہ کروں ، ۱۰۳
۵۶۔۔۔ مجروح ، ۱۰۴
۵۷۔۔۔ غزل ہر پہن پائیں ٹوٹے دشتِ درد پہنچا ہوں ، ۱۰۶
۵۸۔۔۔ صحنِ وشت ، ۱۰۸
۵۹۔۔۔ غزل مجھ پر دھڑا ہوں اونچی نیچی رگڑا ہوں ، ۱۱۰
۶۰۔۔۔ طلوع ، ۱۱۲
۶۱۔۔۔ فائز تک ، ۱۱۳
۶۲۔۔۔ غزل اگر نہ دروہی روح میں اتر جاتا ، ۱۱۴
۶۳۔۔۔ ایک افکار ، ۱۱۶

انتساب

اپنے اُن دلِ حسا انداز کے ناک
جن سے میری حیاتِ فن کو دوام

راقبہ۔۔ وہ مری شریکِ حیات میرے دکھ سکھ ہیں میرے ساتھ رہی
دو جہاں میری دسترکِ پاؤں رہے میرے بقیے میں کائنات رہی
میرا نقاب۔۔ میرا نورِ طشیر روح کا چین ، آنکھ کا تارا
میرا بیٹا بھی ، میرا ساتھی بھی میرا پیارا ، مرا جگر پارا

فن انہی سے ہے معتبر میرا
جن سے جنت بنا ہے گھر میرا

- ۱۱۰۔۔۔ تہ بہ آؤ تو رکھوں ، ۲۰۹
۱۱۱۔۔۔ بڑا ، ۲۱۰
۱۱۲۔۔۔ روشن کا اپنی شب پہ قضا کیوں ہے ، ۲۱۱
۱۱۳۔۔۔ دائرے ، ۲۱۳
۱۱۴۔۔۔ غولہ ، ۲۱۳
۱۱۵۔۔۔ عشق بے دم ہے تو فردا کا دکھنا ڈھونڈو ، ۲۱۹
۱۱۶۔۔۔ درِ کمرئی پر صد کا کرکے ، ۲۱۸
۱۱۷۔۔۔ دستِ تقدیر نے یوں نقش اُستاد اُپیل ، ۲۲۰
۱۱۸۔۔۔ ہم کو چاند اور تاروں سے بڑھ کر صفر سارے مہانے لگے ، ۲۲۲
۱۱۹۔۔۔ جیو آنکھیں ، ۲۲۴
۱۲۰۔۔۔ دوسرے دوسے میں جو آج اپنی جہر دیکھیں ، ۲۲۵
۱۲۱۔۔۔ دھند ، ۲۲۷
۱۲۲۔۔۔ نہ جانے کمال و فکر کیوں چمن کے یوں خوشی جہاں کے ، ۲۲۹
۱۲۳۔۔۔ تنہا قہر آشمار ، ۲۳۱

دوا

میری تابد اور میری نشاط
خیر کی مشعلیں بلند کیے وہ مرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں

ریگ زائر جہانت میں مجھ کو ذوق و شوق سفر انہی سے ملا
رات کی بے آفتاب گواہی میں اعتماد و سحر انہی سے ملا

ان مکے گردا رہیں گناہ بہت
ان کی سیرت پر مجھ کو ناز بہت

میری دو اور بیٹیاں ہیں جنہیں منتخب میرے قلب میں جا لے گیا
میری اولاد کی طرح میری ایک بیٹی، ایک منصورہ

غم کی حدت میں ان کا طرزِ تپاک سرور بھوکوں لکھنے لکھاؤں سا ہے
زندگی کی تمسک ز قوی میں تدبیر پیار ان بیٹیوں کا اچھاؤں سا ہے

روحِ افسانیت کی تجسیمیں
رحمتِ ایزدی کی قصوہ بریں

۱۔ بیرون شاہ
۲۔ منظرِ احمد

- ۹۲۔ غزل غروبِ مہر کی کسی نہ خبر، اُٹنی ہے ۱۱۸
- ۹۳۔ افسیِ رمل، ۱۲۱
- ۹۴۔ غزل ہائے گن کی آفت میں بیکلیں ہیں ۱۲۲
- ۹۵۔ برگِ دشمن، ۱۲۳
- ۹۶۔ غزل اہلِ محض کا ٹھٹھ و کیوں ۱۲۴
- ۹۷۔ غزل عشق، ۱۲۷
- ۹۸۔ غزل امِ اُٹھ کے کسی کی آنکھ سے ۱۲۸
- ۹۹۔ رابطہٴ سلسلانی، ۱۳۰
- ۱۰۰۔ غزل برفانی چوٹی پر، ۱۳۱
- ۱۰۱۔ یہ راہبر، ۱۳۲
- ۱۰۲۔ غزل سورج کو کھانا ہے، سو نکلے گا دوبارہ، ۱۳۵
- ۱۰۳۔ غزل موتِ رقیب سے مکر موت کو چھوڑنا کیوں ۱۳۷
- ۱۰۴۔ غزل تفاوت، ۱۳۹
- ۱۰۵۔ غزل عشقِ رمل، ۱۴۰
- ۱۰۶۔ غزل شربتِ حق، ۱۴۲
- ۱۰۷۔ غزل دل و جان بچ کے، اُٹھانے سے اُس کے ۱۴۵
- ۱۰۸۔ سکون، ۱۴۷
- ۱۰۹۔ لاکھن، ۱۴۸
- ۱۱۰۔ ایک پل سے، ۱۴۹
- ۱۱۱۔ غزل جو حقیقت میں سچ درجہ ۱۵۰
- ۱۱۲۔ جی پتا ہے کہ سکرانوں، ۱۵۲
- ۱۱۳۔ غزل سسے بند بھی کہ ہوں بھری راتوں کے ۱۵۵
- ۱۱۴۔ ایک فرد، ایک نازک، ۱۵۷
- ۸۷۔ غزل اللہ قیامت اگر آئی ہے توئی جائے، ۱۵۹
- ۸۸۔ باغی، ۱۶۱
- ۸۹۔ غزل غمِ چھوڑا کا تھا، وہ زنجیرِ پادشہ، ۱۶۲
- ۹۰۔ غزل کبھی سوئے نظرِ کبھی برون کو پہنچا دوں، ۱۶۵
- ۹۱۔ تغیر، ۱۶۹
- ۹۲۔ غزل سمجھتی ہے پاندلی کو روایتِ حجاب کی، ۱۷۳
- ۹۳۔ غزل غلجِ بھگیل کی ہے دیوانی، ۱۷۵
- ۹۴۔ رشتے، ۱۷۷
- ۹۵۔ غزل میں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی نظیر، ۱۸۱
- ۹۶۔ ایک افسانہ، ۱۸۳
- ۹۷۔ غزل جس افسانہ سے بہتے ہوں، ۱۸۵
- ۹۸۔ غزل زنجیرِ سون میں، انجمنِ زلف و لعل پر اسے ہیں، ۱۸۷
- ۹۹۔ غزل در کو جب دل شام میں ڈال آتا ہے، ۱۸۹
- ۱۰۰۔ غزل فریادِ گردنِ گرگِ کمانِ بگ، ۱۹۱
- ۱۰۱۔ غزل ابد میں پیش ہے یا سنو کوئی دیکھ کر، ۱۹۳
- ۱۰۲۔ یہ کیا گونج ہے، ۱۹۵
- ۱۰۳۔ غزل ہر شے اپنی اپنی نوا میں اُٹھتا جاوے کہے، ۱۹۷
- ۱۰۴۔ غزل رات کے ساتھ ہی رخصت ہو، مناسبت اپنا، ۱۹۹
- ۱۰۵۔ مجاہدِ دہلوی، ۲۰۱
- ۱۰۶۔ غزل عالمِ بزمِ بویا ہوں نہ سونا چاہوں، ۲۰۳
- ۱۰۷۔ جہنم، ۲۰۵
- ۱۰۸۔ غزل یہ جو کہہ کر کی تنہائی ہے، ۲۰۸
- ۱۰۹۔ یاد، ۲۰۹

دوام
۱۳

دع

مجھے نہ مر دے کہ کیفیتِ دوا می ہے
مرے خدا! مجھے اس سزا ازنا قالی ہے
میں تیرے پتھر رحمت سے شاد کام تو ہوں
کبھی کہیں مجھے اس سزا پر تشنہ کالی دے
مجھے کسی بھی معرزا کا ہم درکاسب نہ کر
میں خود گلاؤں سے نہیں وہ نیک نامی دے
وہ لوگ جو کئی صدیوں سے ہیں فیضِ نبی
بلند ہوں، تو مجھے بھی بلند بامی دے
تری زمین بہ تیرے چسپن رہیں آباد
جو دشتِ نال ہے، اسے بھی تو لہر قالی ہے

دوای
۱۴

دوای
۱۴

بڑا سرور مہی تجھ سے ہم کلامی ہیں !
 بس ایک بار مگر ذوقِ خود کلامی دے
 ہیں دوستوں کی طرح خاک اڑائیں سکتا
 میں گہو راہ مہی، مجھ کو نرم گامی دے
 عدائے تم ہوں، تو کر آنسوؤں کی نذر، مگر
 رفیقِ گل ہوں تو مجھ کو جہا غرامی دے
 اگر گردوں کو کچھ اس طرح سر بلند کروں
 کہ مار کر، مراد شمن مجھے سلامی دے

تاریخ ۱۹۶۶ء

روز، ایک تباہ سورج ہے نرمی عطیوں ہیں
 اعتماد بڑھتا ہے صبح کی نقشب توں ہیں
 شاید ان زیاروں میں خوش دلی بھی دولت ہے
 ہم تو مسکراتے ہی گھر گئے گداؤں میں
 بھائیوں کے جھگڑے ہیں ابے ردا ہوئیں بہنیں
 اور سر نہیں چھپتے، ماؤں کی وحشاؤں ہیں
 بارشیں تو یاروں نے کب کی بیچ ڈالی ہیں
 اب تو صرف غیرت کی راکھ ہے ہواؤں میں

دہلی
۱۸

سُونی سُونی گلیں ہیں بُجڑی بُجڑی چوپائیں
جیسے کوئی آدمِ خور اچھر گریب ہو گاؤں میں
جب کسان، کھیتوں پر دوپہر میں سبتے ہیں
لوٹتے ہیں سگ زادے، ٹیکڑوں کی چھاؤں میں
تم ہمارے بھائی ہو۔ بس ذرا سی دوری ہے
ہم فاصل کے باہر، تم محل ساراؤں میں
خون رسنے لگتا ہے، دن کے انہوں سے بھی
زخم چپ نہیں سکتے، ریشمی رداؤں میں
دوستی کے پردے ہیں، دشمنی ہوئی اتنی
رو گئے نقطہ دشمن، اپنے آشناؤں میں
اُمں کا خدا حسِ فطرت جب کہ نخلِ زیتوں کا
شاخ شاخ بُٹاتا ہے، بھوکِ فاختہ اُن میں

دہلی
۱۹

ایک بے گندہ کا خون، عسقم جگا گیا کتنے؛
بٹ گینا ہے اک بیٹا، بے شمار ماؤں میں
سبے وفار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں
خاک سے جُدا ہو کر، اپنا وزن کھو مچھٹ
آدمی مطلق سارہ گیا حسلاؤں میں
اب ندیم منزل کو ریزہ ریزہ چستنا ہے
گھر گیا تھا بے چارہ، کتنے رہ نماؤں میں

۳۳

اُن کی جنت بھی کوئی دشتِ بلا ہی ہوگی
زندہ رہنے کو جلازت نہیں بننے دیتے
ہاں مرتے تو بے برحق، مگر اکیلا حیات
کوئی پیرا پیرا راحت نہیں بنے دیتے
فکر، فنی کے لیے لازم۔ مگر اچھے شاعر
اپنے فنی کو کبھی حکمت نہیں بننے دیتے
وہ محبت کا تعلق ہو کہ نفرت کا ندیم
رابطے، زلیات کو غلط نہیں بنے دیتے

فروری ۱۹۷۹ء

۳۲

○

ہم کبھی عشق کو دشت نہیں بنے دیتے
دل کی تمذیب کو صحت نہیں بنے دیتے
لب ہی لب، ٹوکھی۔ اور کبھی چشم ہی چشم
نقشِ تیرے، تری صورت نہیں بنے دیتے
یہ سدا سبہ جو چمکتے ہیں پس ابر سبہ
تیرے غم کو مری عادت نہیں بنے دیتے
ٹوکھی رات، کبھی دن، کبھی ظلمت، کبھی نور
تیرے جلوس، کبھی دھرت نہیں بنے دیتے

دور
۳۰

دور
۳۱

ہم سفر

پانڈی سمت بھب اڑنا ہوں
تو ہر بار عجیب حادثہ ہو جاتا ہے
وہ جو مٹی کا رہا جلتا ہے میرے گھر میں
اپنی قوس پر رکھے، آتا ہے
اور کہتا ہے:
ترسے ساتھ چلوں گا کہ سفر دور کا ہے
اور تو راہ سے بھٹکا
تو میں بے اسرارہ یاؤں گا!

جنوری ۱۹۷۶ء

ہفتے کھلتے

خسک پٹنے
ہوا کے بھجولی
کو دسے، پھاڑتے، لگتے ہوئے
وہاں توجہ بھاتا ہے
مملکت زندگی کی طے کر کے
سرحد بستی پہ جا پہنچے

نومئی ۱۹۷۶ء

دوام
۲۲

دوام
۲۳

چاند

منقبت کا فثور

اسے میں نے دیکھا

تو سوچا

کہ اب چاند نے

اپنے سورج سے

کو مانگنا چھوڑ دی ہے !

جنوری ۲۰۱۶ء

چلو کچھ اور سوچیں

بم نے اب تک جو بھی سوچا ہے

وہ صدیوں کی پرانی سوچ ہے

اب علم جو ہر ہے

یہ وہ لمحہ ہے

جس کے شہیروں پر مینڈ کر

ہم کو نہیں سے اپنا نام توڑنا اور آسمان سے جوڑ لینا ہے

دوام
۲۴

چلو کچھ اور سوچیں

اب یہ دنیا

اور انسان

اور اس کے ٹکڑے

پر لسنے، کھم جو درد، بھر بھر سے، بد رنگ، بے لذت فیملے ہیں

چلو کچھ اور سوچیں

اور محبت کی بنائیں تہ کیوں

اور حسن کی قدریں بدل جائیں

چشمی دھوپ پر

اور چاندنی راتوں پہ بخت بھیج کر

پھولوں پہ تھوکیں

ندیوں کو پتھر دی سے پاٹ دیں

رشتوں کو کاٹیں

دوام
۲۵

راہوں کو روند ڈالیں

سولیاں گاڑیں

چلو کچھ اور سوچیں

لفظ سے مقبوم کی دولت ایک ہیں

اور اس سے پتھر بنا ڈالیں

زبانیں، لوگ، خیر کی طرح سینوں میں گاڑیں

فنگی کو چنچ میں بدلیں

سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں

وا دیوں میں دل دلیں بھر دیں

چلو کچھ اور سوچیں

اب یہی سوچیں

کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سچا ہے

۲۶

۲۷

وہ سب کفر ہے
اور حق فقط یہ ہے
کہ جو کچھ ہے
نہیں ہے
کچھ نہیں ہے
واہمہ ہے
خواب ہے

اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں !

جنوری ۱۹۷۹ء

فشار

پھول جب کھل چکا تو کہنے لگا:

اب مرا حسن میرے بس ہیں نہیں
اب میں اپنی بھی دسترس میں نہیں

جنوری ۱۹۷۹ء

۲۹

کون گیا کون آیا

ذہان نے بیڑیوں سے کون اتارا جا رہا ہے!
اس کی ہر ہر چاب میں سینوں کی دُوری ہے!
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے عالمِ سکرات میں جو سانس آئی تھی
وہ واپس جا رہی ہے!

جنوری ۱۹۷۶ء

۲۸

قبر پر پھول

اب کے بارش جو ہوئی
میں نے یہ دیکھا
کہ میرا وہ جو اک قبر تھی
(تایہ کس دیوانے کی)
اس پر اک پھول کیڑا ہے
جو ہواؤں کے پتھروں سے تڑپتا ہے
تو پاتال سے بننے کی صدا آتی ہے

جنوری ۱۹۷۶ء

دوای
۳۱

دوای
۳۱

پیت جھڑکی تنہائی

عجب حال و خد بختے !

نثارہ کی آنکھیں

نثارہ سے لب

اور جھینڈا چہرہ !

بدن — اک چمن

چال — باوصفا

بات — خوشبو

محبت — بہت گہری آسودگی فصل گل کی !

مگر آج وہ خال وعدہ کیجھ کر سوچتا ہوں

کہ میری بصرات کو بہت جھڑکی تنہائی نے کھایا ہے

خواب

چاندنی نے رنگ شب جب زرد کر ڈالا۔ تو میں

ایک ایسے شمر سے گزرا۔ جہاں

صرف دیواریں نمایاں تھیں

چھتیں معدوم تھیں

اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے

جسم غائب تھے !

فروری ۱۹۹۶ء

فروری ۱۹۹۶ء

دو اہ
۳۵

دو اہ
۳۳

○

رہنما

جمال فن کا، ترے اور میرے گھر میں رہا
کمال فن کا مگر دستِ کوزہ گر میں رہا!
میں تجھ کو پاس کے، تجھی کو صدائیں دینا ہوں
تو میرے دل میں، آن کر بھی کیوں سفر میں رہا
بیسے بھی دکھوں، تھے حسن کی لپیٹ میں ہے
کہ بیسے سارا جہاں تیرے ہی گزریں رہا
تھے وصال۔ تیری بادشہی جمال میں بھی
تیری جدائی کا منظر مری نظریں میں رہا

رات جگمگ میں آئی
تو چپے کی آنکھوں نے
دو مشعلیں یوں جلائیں
کہ ہیں راستے سے بھٹکنے کی عیاں شیاں بھول بیٹھا!

فروری ۶-۱۹۷۰ء

دوسرا

دعا

رہے نہ دل میں اڑانوں کے سوسے باقی
یہ اور بات کہ رخصتہ سابل و پر میں دیا
یہ اکثافت اگر کفر ہے، تو کیسے کیجے
فرشتے عرش پر، لیکن خدا بشر میں دیا

ترقی یافتہ

بستی بستی شور اٹھتا ہے،
» ہنگامی! ہنگامی! «

خودی ۶۶، ۱۹۶۶ء

مغرب دالے
سوئے کے اہل زیور پڑھ کر
کتنی اُداس آوازیں قہقہے ہیں،
» دیکھو! «

مشرق کو خود اس کی ترقی، کس نہ آئی! «

خودی ۶۶، ۱۹۶۶ء

دوالم
۳۹

دوالم
۳۸

دھوپ، کرفوں میں پرٹے جائے گی ساری نئی
رات بھر پھولوں نے دستِ شبِ شبنم پی تو کیا

○

اب تو یہاں جوں سے جل تھل ہر گسٹیس آبادیاں
اب مرے کھیتوں کی لاشوں پر گھٹنا برسی، تو کیا

جو جس گھر میں طہین اس گھر کو کیسے بخش دیں
ٹوٹے آتے ہیں ہم لوگوں کو اپنے ہی، تو کیا

ہم نہیں ہوں گے تو پھر کس کام کی تحسینِ شعر
روشنی اک روز ان لفظوں سے ٹھٹھے گی، تو کیا

دور کی آہٹ تو اپنی ہی ہے اب سر پر نیریم
آگہی نے سرتوں کے بعد کروٹ لی، تو کیا

اب ترے رخ پر محبت کی شفق پھولی، تو کیا
حسنِ برحق ہے مگر جب بچہ چکا ہو جی، تو کیا
بب تراکتا ہے، تو نفقہ دیر کا حکوم ہے
تو نے نفرت کی تو کیا، تو نے محبت کی تو کیا

اب کہاں سے لاؤں وہ آنکھیں جو لذتِ شب ہو
دستِ باران نے میرے در پر جو دستک دی، تو کیا

بھر کی شب، اس قصوف سے کسے تسکین ہو
سامنے رہتی ہے تیری شکل پیاری سی، تو کیا

جذب ہو جائیں گے خاکِ بے حسی میں سات رنگ
آنسوؤں کے ساتھ چپکے ہے اگر غول بھی، تو کیا

دہلی

دہلی

جبر

ہوا کے ڈر سے گلوں نے قبائیں سی لی ہیں
اگر نمود ہوشنم کی، کس اب پہ ہو
کمال گئے وہ گلابی ہستیلیوں سے برگ
کمال گئیں وہ جبینیں، کمال گئے وہ لب
جو دھوپ شاخ سے چھن کر کرن کرن پکی
کے لگائے گی سینے سے کس کو چہرے کی
مسافروں نے اگر اس جگہ قیام کیا
قویہ زمان کی آمد کے انتظار کے بعد
انہیں گئے اور کس صحرا میں جا کے دم نہیں گئے
کہ ان کو دشت سے نکل گئیں بلاتی رہیں
وہ دب گلوں کی نیاؤں میں سہرنا فو ہیں

۱۹۶۶ء

تھکن کا ایک لمحہ

سڑک کس قدر سخت، سفاک اور کھردری ہے
وہ جو توی کے جڑے
سنے ہاتھوں کے ربر
سیردوں کے ارادوں کو
یونیاٹ جاتی ہے
جیسے کوئی اثر دیا ہے
یو صدیوں کا بھوکا ہے
اور زندگی کو ٹھٹھا چلا جا رہا ہے !

مئی ۱۹۷۲ء

۴۲

۴۳

○

آئے، کوئی انقلاب آئے
دل پر نہ مگر حجاب آئے
پیسے کے قفس کو توڑتے ہی
موتی میں بلا کی آب آئے
افس کی کتاب زندگی میں
کیوں کرب کے استغاب آئے
جب برا سوال ہے نہیں سے
افلاک سے کیوں جواب آئے
ذرات کا ذکر ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں آفتاب آئے

قرون پہ محیط علم تیسرا
لمحوں کا مجھے حساب آئے
سیلاب خود آگئی جب اٹھا
کسار بھی زیر آب آئے
زندہاں سے تو میں نمٹ چکا ہوں
اب دور کوئی غدا اب آئے
ہر روز نیا جہنم لیا ہے
بجھ پر تو کئی شباب آئے
جو شاخ تنے کی نفی کر دے
اس شاخ پر کیا گلاب آئے

دوا
۳۵

دوا
۳۳

○

قریب مجت

بست شدید تشنج میں بہستلا لوگو!

یہیں قریب مجت کا ایک قریب ہے

یہاں دھوئیں نے مناظر چھپا رکھے ہیں، مگر

افتخار کا دیاں سے دکھائی دیتا ہے

یہاں تو اپنی صدا کاں میں نہیں پڑتی

وہاں خدا کا تنفس سنائی دیتا ہے

۱۹۶۶ء

یوں تو میں دشت پر بھی پڑو گا شن و کیوں

سایہ گل میں مگر سانپ کا مسکن دیکھوں

اب تو یہ دست تھی کاٹنا جہاز ٹھہرا

مدد توئی سے کسی پھیلے ہوئے دامن دیکھوں

موسکے قشند دہن ہل گئے کھیتوں کے بدن

اب تو برسات کے اسکان کو روشن دیکھوں

اتنا چمکا مجھے افشا سے حقیقت کا پڑا

آسمانوں میں بھی روزانہ، پس روزانہ دیکھوں

دوایہ
۶

مجھ پر ہے شیخ کی تکریم تو لازم نہیں
اسے نزدیک سے دیکھوں تو برہنہ دیکھوں

کبھی کبھار میں کرتا تھا میں معدن کی تلاش
وہ زمینوں میں بھی سینوں میں بھی آ کر نہ دیکھوں

جون ۱۹۷۱ء

دوایہ
۷

”روح و بدن کے خم و پیچ“

کتنا شفاف ہے بدن تیرا
کل جو تو میرے پاس سے گزری
میں نے دیکھا، کہ تیرے چہرے پر
بھیس کا سا سکون چھایا ہے
اور ترسے دل پہ جب نظر ڈالی
میں نے وہ حشر سا پایا دیکھا
جس طرح زرد سا آیا ہے

جون ۱۹۷۱ء

دہلی
۲۹

دہلی
۳۸

میرے دل پر تو گریں آٹے بن کر یونہی
کون سی یاد کے صحرائے جو برسات میں تھے

اس سبب سے بھی تو میں قابلِ نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے جہت کے مری ذات میں تھے

صرف شیطان ہی نہ تھا مسکینِ نیکویم
عرش پر جتنے فرشتے تھے مری گھات میں تھے

جولائی ۱۹۷۶ء

○

وہ ہوا اک عمر سے مصروفِ عبادات میں تھے
انکھ کھولی تو ابھی عرصہ ظلمات میں تھے

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الہی کا ثبوت
پھول بھی درخت میں تھے مستز بھی جذبات میں تھے

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا، نہ منشا کے حسد
عادتے مجھ پہ جو گزریں عمرے حالات میں تھے

میں نے کی تیرے فطر پارے تو یہ راز کھلا
آسمان تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے

۵۰

۵۱

کیوں دکھائیں کس بے کس کو اسی کی تصویر
ایک وگیر کو کیوں اور بھی دگیر کریں
اگر انسان فرشتے نہیں، جنات نہیں
مرد میں قصہ ہواؤں میں نہ تعمیر کریں
دل اگر خون چھو ہے تو یہ بیکار نہ بجائے
اپنے اس عہد کا منشور ہی تحریر کریں

نئی تعبیر

غم کو تسخیر کریں، درد کو زنجیر کریں
آؤ حالات کی کچھ اور ہی تعبیر کریں
جب کبھی اہل قلم صدق کی تفسیر کریں
وہ جو تکفیر، مامور ہیں، تکفیر کریں
اے خدا، کفر ہمارا ہے بس اتنا سنا، کہ ہم
تیری تکلیف تو انسان کی توقیر کریں
جن کے اعمال کا شرمو آئینہ حیات
آج کل فلسفہ خیر پھرتا رہا کریں

۱۹۷۹ء

دہلی
۵۲

دہلی
۵۳

اُس کا احسانِ نگرِ نفرت کا پرف ہیں کب سے
مجھ کو اُن ناک نشینوں کی محبت دے دی

مجھ سے کافر یہ فرشتے کا اتنا ہی غضب
پھر ستم یہ : اسے انسان کی سببت دے دی

اُنہ دیکھتے ہی، میں نے پلٹ کر دیکھ
عزت نے جیسے مجھے بھی تری صورت دے دی

○

اہلِ ثروت پر خدا نے مجھے سبقت دے دی
اس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

خیمہ زنِ حسن کو دیکھیں افقِ مسرور پر
یہی نے فن میں اُسی اک خواب کو وسعت دے دی

وہ کبھی مہرِ کبھی ماو، کبھی دلی، کبھی راست
اتنی کثرت کو مرے لائق نے وحدت دے دی

اپنے اندر سے شکوے کا محصل ہو تو کروں
غم دے اساتذہ سی غم سنے کی راحت دے دی

جست ۶۱۹

دوام
۵۴

۵۵
۵۵

جانے کو ارض پہ، یا مرتج پہ ہوں
چاند لگے چو نگاری کے نقشے کی طرح

نئے نئے اوبام، قدیم ایسٹونز پر
پھیل رہے ہیں، مگر لی کے جلے کی طرح

○

اک اک رہبر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے
بہنوں کے بل کھڑے ہوئے بچے کی طرح

یہ شاید بچ کنے کا ہسنگام نہ تھا
اب گھبراہٹ میں، چھوٹے کی طرح

باطل سے ٹکرا کر جب حق پٹ ہے
سینے پر سے گزرا ہے، پیٹے کی طرح

نظائر اسس پر صبح کا پردہ پڑتا ہو
رات کا ماتھا روشن ہے، تارے کی طرح

بار بار بھی چلتی ہے، آسے کی طرح
پھولوں سے آنج، تہی ہے، شعلے کی طرح

زندہ ہوں، یا کوئی ٹھکانا دھونڈتا ہوں
دستِ شجر سے چھوٹے پتے پتے کی طرح

کتنی خوشش رُو، اور کتنا زہر لایا کھتا
مجھ کو تو وہ شخص لگا، میرے کی طرح

اسس کی یاد سکون بھی اور بے چینی بھی
ماں کی گود میں روتے ہوئے بچے کی طرح

دو
۵۶

دو
۵۷

گردش کے آئینے میں بیٹھا ہے حسد
حیدر نظر تک تنے ہوئے حلقے کی طرح

بیری خاک، بسیرت کی اکسیر بنی
مجھ کو دیکھنے پینا تھا، سرے کی طرح

میرے فن کا کام حیات افزائی ہے
صحراؤں کی وسعت میں نالائے کی طرح

اگست ۱۹۷۶ء

سر سے در دور نہیں، رنگ سے سر دور نہیں
صاف تھا ہر پہ کما پیا بن سفر دور نہیں

دل میں اتری چلی جاتی ہے ستارے کی آئی
ہو نہ ہو، اب شب وعدہ کی سحر دور نہیں

کتنا خوش ہوں دور دیوار کی دیرانی سے
اس کا مطلب ہے یہاں سے مرا گھر دور نہیں

عجز اچھا، مگر اس کی کوئی حد ہوتی ہے
قم و عار و ٹھکے مانگو تو آتش دور نہیں

نوع انساں کی محبت میں سہولت ہے تیر کم
دور رہتا ہے خدا، اور ہشہر دور نہیں

اگست ۱۹۷۶ء

دعای
۵۸

افصال

دوستو! تم تو کندھوں سے اوپر نظر ہی نہیں آ رہے ہو
چلو اپنے پیہر سے مذمت کی الماریوں سے نکالو
انہیں جھاڑ کر گردوں پر رکھو
تم ادھر سے نہیں ہو تو پھر سے دکھائی دو

ستمبر ۱۹۷۶ء

دعای
۵۹

گناہ و ثواب

مہربانی راست نے
اپنی آغوش میں
کتنے ترسے ہوئے گناہوں کو بھینچا
دعا سدا دیا
اور انہیں اس طرح کے گناہوں کی ترغیب دی
جس طرح کے گناہوں سے میلادِ آدم ہوا تھا

ستمبر ۱۹۷۶ء

دوایم
۶۶

دوایم
۶۰

آنے والے منظروں کی نذر

سہرت — دو بٹے سورج نے
قرطاسِ فکس پر
اک عجیب تصویر کھینچی ہے!
مگر تصویر میں جو رنگ برتے ہیں شاعروں نے
وہ کہتے ہیں:
انہیں الفاظ میں محفوظ کر کے
آنے والے منظروں کی نذر کرنا
انہما کے فن پرستی بھی ہے

سخن ناشناس

میں جب شعور تک ہوں
دیوارِ فردا پر
میرا قلم
تو فکس کے رنگ میں
پھول سے نغمہ لکھتا ہے
لیکن کوئی یہ زبان پڑھنے والا نہیں!

ستمبر ۲۰۱۰ء

دوای
۶۲

نقلاتی ہیں
اور فنی کی دیانت بھی
سب دوت بھی

جو بادل دور ہیں
لاکھوں کروڑوں کوں پر ہیں
دور جو نزدیک ہیں
ان کو اگر چھو لو

تو پریش رہیگ جائیں سات رنگوں میں !

قریب و دور ہیں جو فاصلہ ہے

اس میں گہرا اور نیلا اور چمکیلا خاک یوں پڑ سکوں ہے

جیسے تاحہ نظر پھیلے کندر پرستے جب کشتی گزر جائے

تو وہ آسودگی کی سانس لیتا ہے !

دوای
۶۳

جو بادل دور ہیں

اب تک طلائی تھے مگر اب زرہ ہیں

اور جو نزدیک ہیں

اب تک گلابی تھے مگر اب شعلہ و ش ہیں

اور نیلا آسمان اب سبز ہے

اب سرمئی ہے

اب فقط لالہ استغاثی کے خلا کا ایک صحر ہے

جو بادل زرہ تھے

اب گھٹتے جاتے ہیں

جو بادل شعلہ و ش تھے

بجھتے جاتے ہیں

ادھر مشرق سے جو سیلاب شب اٹھتا ہے

سنائے کی عمر دن کی زبانوں سے

گئے خورشید کی مستقیم فنی کو چاٹ لیتا ہے

دو
۶۵

دو
۶۳

میلاد

بہت ندر دپتوں کے بھر میں
اک سبز تپہ آگ
اور شجر
اکٹھا دت توانائی کے جوش میں تن گیا
ایک جھونکا جو گارا
تو لے کر اسے اپنی آغوش میں
جھوٹے، گلگانے لگا

ستمبر ۶۹

گوشتیانِ تاریکی کے اس آٹھ میں
پہلا ستارہ آسمان پر جب چمکتا ہے
تو وہ اپنی منہسی پر غبطہ کرتا ہے
نرم ہر گوشہ میں کتنا ہے
کر سوج ڈوبنا کب ہے !

ستمبر ۶۹

دہام
۴۴

شبِ معصوم

نیز سے رخسار پر پریر جو اپنا ہوا ایک تنی ہے

جوازِ شبِ تار ہے

اور یہ شب

چاندِ جانب سے اُٹھتی ہوئی روشنی اور شفق ہیں گھری

اتنی معصوم لگتی ہے

جیسے یہ آسمان کے سمندریں چاند اک جزیرہ بنا

اپنے انجام سے بے خبر

تیرا ہے

ستمبر ۱۹۶۶ء

دہام
۴۴

مہذب

مجھے کل مرا ایک سامعنی ملا

جس نے میرا راز کھولا

کہ۔ ”اب جذبرِ دشوق کی دشتوں کے زمانے گئے!“

پھر وہ آہستہ آہستہ۔ چاروں طرف دیکھتا

مجھ سے کہنے لگا:

”اب بناؤ محبت پیٹو“

جہاں سے بھی مل جائے دولت۔ سمیٹو

غرض کچھ تو تہذیب یکسو!“

ستمبر ۱۹۶۶ء

دو ام
۶۹

گزر چڑھا جو کہیں جسموہ زار سینا سے
تو طور پر کس انسان کو بلاؤں گا میں
ہمیں خدا کا، مجھ انسان سے بھد نہ پاسے کا
اسے متاؤں گا کیسے، جسے بناؤں گا میں

دو ام
۶۸

○

نومبر ۱۹۷۹ء

بکھر تو جاؤں گا لیکن اجب نہ جاؤں گا میں
حیات کھد کے، بھری کائنات پاؤں گا میں
جو کھر کھنڈر ہی کھنڈر ہیں انہیں مٹاؤں گا میں
جہاں دیے نہیں جلتے، دیے جسمناؤں گا میں
بگڑ چکی ہیں بہت عادتیں عسٹ صر کی!
گھٹائیں بن کے مبرر گزرا چھپتوں گا میں
تو میرے دل ہیں؛ ترسنے کا حوسندہ تو رکھا
یہاں سے عرش کا منظر تجھے دکھاؤں گا میں

دوایہ

دوایہ

○

جو لوگ دشمنی جاں تھے، وہی ہمارے تھے
منافقے تھے جنت میں، نئے خسارے تھے

یہ عشق تھا، کہ فقط عشق جس کا مسئلہ تھا
اس امتحان میں بھرے، نہ استعارے تھے

جو لوگ ترکِ طلب پر بندھے تھے، ان کے لیے
جہاں رُکے تھے سیفے، وہیں کنارے تھے

خود اپنا آپ گنوا کر جنہیں خدا نہ بلا،
وہ نیرنگی کے نہیں، روشنی کے مارے تھے

حضورِ مٹا دیں اتنا ہی طریض کرنا ہے
جو آفتابِ ارتقا سے تھے حق ہمارے تھے

یہ اور با ست، ہماری گریز پائیکلیں
گلوں کے ہم نے قومِ فتنہ بہت اُٹائے تھے

خدا کرے کہ تری عمر میں گئے حبائیں
وہ دلی جو چہنے تو ہے ہر چہیں گزارے تھے

اب اذنی ہو تو تری نولفت میں پرو دیں پھول
کہ آسمان کے ستارے تو استعارے تھے

قریب آئے تو ہر گل تھا حسنا نہ زنجور
ندیم دوڑ کے منظر تو پیارے پیارے تھے

دسمبر ۱۹۷۶ء

دعا
۴۳

دعا
۴۲

وہ دیکھے

کہ آنکھوں میں اب جن دریافت کرنے کی ساری چمک بچھ چکی ہے
کھنڈر کے دیو کیوں سے آخر کھنڈر کے سوا کیا نظر آسکے گا!

وہ دیکھے

کہ جو لب فقط ذکرِ رب یا محبت کے اظہار یا پھر غنا کے لیے
واجب

آج آدھل نوکھلتے نہیں

اور کھلتے ہیں جب انوثرار سے اُگتے ہیں

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے

کہ سینے — دھیتے جو نئے گہریائی کے اسرار کے

اب دیاں وہ ہم کے اُتر رہے

کیونچلی پر بدلتے ہوئے کیونچلی

ہمساتے ہیں پھنکاتے ہیں

اشوب

خدا اُلو بلاؤ

کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے

یہی مٹی کا انساں ہوں

یہی آسمان کا فرشتہ نہیں

اس لیے معتبر بھی نہیں ہوں

خدا اپنی آنکھوں سے دیکھے

کہ وہ سر جو صدیوں کے سجدوں سے نرمی ہیں

اب آسمان کی طرف اُٹھ رہے ہیں

دوام
۴۵

دوام
۴۵

صیہن جسم، روحوں کے تاریک بحر میں
مدِ نظر سے پرے اک دیے کی طرف بڑھ رہے ہیں
مگر ہر قدم پر یہ مدِ نظر اک قدم اور سستی علی جا رہی ہے

جو انسان کے ذہن کی شاہراہیں نہیں
ان پر یقینوں کے کشتوں کے پتے لگے ہیں

جو اس کے تصور کے خرد وں تختے
ریزہ بریزہ پڑے ہیں

جو اس کی پرتوش کے میاں رختے
لو کہ خیر کی مانند ان راستوں پر گڑے ہیں
جو یادش بخیر اک زمانے میں سیدی خدا کی طرف جا رہی تھیں
مگر اب فقط دُروں میں بھٹکتی ہوئی رہ گئی ہیں

خدا کو بلاؤ

کہ اس کا یہ شہکار نہیں

اپنے محور سے پھٹنے لگا ہے

وہ چھوٹوں بڑوں اور نیکیوں بدوں کے قبیلوں میں بٹنے لگا ہے

وہ جو عرض تک پھیل جانے کے گڑھ ہوتا تھا

سکڑنے لگا ہے، سمٹنے لگا ہے

وہ آشوب، جو اس نے اپنی ذکاوت سے پیدا کیا تھا

اسی سے ٹٹنے لگا ہے

دعا
۴۶

دعا
۴۷

اپنی پہچان کے سفر پر
نکلے تو کسی کے ہو گئے ہم
یوں ہم نے یافنس کا بار
غزلوں میں بٹا سو گئے ہم

○

مرکز جنت میں گئے ہم
فردوسِ حیات کھو گئے ہم
آنکھوں میں کٹی نئی رات ساری
سورج نکلا تو سو گئے ہم
گو ہم کو حسد نہ لاحقہ آیا
امکان کے بیج بو گئے ہم
نقا، برکرم چلنے مقصود
رو کر صحرانچھو گئے ہم

جنوری ۲۰۱۳ء

دو:۴

دو:۴

عقل اور وجدان

اضافی

ایسی دنیا سے ہیں کوئی توقع کیس ہو
جس میں وجدان پر ہو عقل کی ضد کا الزام
عقل انسان کے پیکر میں تو مجبور نہیں
اور وجدان ہے اس عقل کی پرواز کا نام
سوچتے سوچتے آجاتے ہیں ایسے پل بھی
جب گھل جاتا ہے یہ عالم اشیا کا نظام
اور ہم لوگ خلا تا بہ حسنہ دیکھتے ہیں
جس طرف دیکھتے ہیں صرف خدا دیکھتے ہیں

کیندہ رفت مبنی سر پر نہیں ہو قوت
نمیدہ پشت درختوں پہ بھی، سحر کے قریب
طیور، نعمہ سرائی کی دُھن میں اتریں گے!

جنوری ۲۰۱۰ء

دعا
۸۱

کچھ خالی دھند پتھر لڑو، یہ لو کا پتھریسٹراوی نہ ہو
اک سورج ہوئے گلشن کی، کہتے ہیں سورے صحرا بھی گئی



وہ صحت پر تہنم نہ طرز کرو، کھیتوں کو خشک ہی رہنے دو
اب سورے فلک کیا دیکھتے ہو، بدلی تو برس برسا بھی گئی

(منظر اقبال)

ہاسنے پر جوت کیا شے تھی، تڑپا بھی گئی، پتھکا بھی گئی
ایک آواز افق دھندلا بھی گئی، آفانی سے چمکا بھی گئی

کیوں کہتے ہو فیس اکیلا تھا جب قریہ ناپرساں سے گیا
ساتھ اس کے رشتے لیلیٰ کی خوشبو بھی اور ہوا بھی گئی

جنت سے مجھے دکا نہیں، یاروں سے مگر یہ پوچھنا ہے
یہ کون سا ہے معیار وفا، امید گئی تو دفن بھی گئی

یہ صدی بظاہر بری تھی، یہ صدی کچھ ایسی بُری نہ تھی
گو اس نے بھجائے جراثیم، قندیلیں نئی محسوس بھی گئی

جنوری ۲۰۱۹ء

دہائی
۸۳

دہائی
۸۴

منطقہ داخل

شما ہیں

جو مائے ہوسے اک تنکے ہار سے سورج سے
چو نگاریں کی طرح چن کے دامن میں بھری نہیں
اب رفت کے نرم گالوں کے فزعل بہن کر ٹپٹ آئی ہیں
اب دھکتے ہوئے فریش پر پاؤں ٹٹھکے مجھے رہ گئے ہیں!
سوائیں

جو ٹوبن کے پوری صدی تک جلی اور چلی تھیں
اپنا جہنمی، گر پڑی ہیں!
زہیں کی زباں گنگ سب سے
آنکھ پھرائی ہے
ہوٹے نیلے ہیں

بازو لگتے ہوئے ڈھیلے ڈھیلے ہیں
پاروں طرف اک بھیانک بھیدی کا ویرا نہ ہے
جس میں انسانی چہجے
تو الفاظ اولوں کی مانند جم جائیں!

اب زندگی کے پچھلے کالامکان
اک ایسے سورج سے وابستہ ہے
جو کہیں سے بھی آئے
وہ مشرق سے نکلے کہ مغرب سے ابھرے
وہ افلاک سے گر پڑے
یا زمیں سے رگل آئے --
بس ایک سورج ہو
جو انجھاؤ سنسن کا دشمن ہو
اور ڈھبنا جس کو آنا نہ ہو

دوہ
۸۵

بہشت دیکھنا ہے جس سے ہم نے ہجرت کی
نہ حق جاننے، نہ جھگڑا پھیلانے آئے ہیں
شجرہٴ کاکے یہ کتنا، شجر سے دور رہو
ہم اس تضاد کے کچھ بھید پانے آئے ہیں
زمین، روزِ ازل کی طرح اُجڑ جائے
ہم اپنے فن کی اگر دوا دیا نے آئے ہیں

جنوری ۱۹۷۷ء

دوہ
۸۳

ذرا آسمان تک

فلک پر آئے انسان بھانے آئے ہیں
کسی کی پردہ درِی کے زمانے آئے ہیں
ہم آپ اپنا محنت نہ رہنا نے آئے ہیں
ہم آسمان کو زمین سے ملائے آئے ہیں
ہمارے پیشِ نظر تھی حسد کی در بدری
سفر میں یوں تو ہزاروں ٹھکانے آئے ہیں
ہماری زندہ دلی دیکھنے کے لائق ہے
لوگوں میں مگر سینہ تانے آئے ہیں
فرشتے راستہ دیں، اور یہ گمان نہ کریں
ہم اپنے دوٹھے خدا کو ماننے آئے ہیں

دوام
۸۶

○

یہ برزخ یا قیامت کی گھڑی ہے
بے دیکھو، اسے اپنی پڑی ہے
اگر ہیں ذہنی یزداں کو کموں پھولی
تو وہ اس پھولی کی اک پنکھڑی ہے
دفا کے ہیں عجب معیار میرے
محبت دقت سے کتنی بڑی ہے
ہے میرے سامنے منزل انوکھا
خدا ہے اور ماوی کی جھڑی ہے

دوام
۸۷

گھڑی پہلی محبت کی محسب عقی
ابھی تک یاد کے در پر گھڑی ہے
بجب گلزار ہے تمغیہ ہنسناں
کہ اس کے وسط میں سوئی گھڑی ہے

دو
۸۸

دو
۸۹

مری حریفوں کو ہزار کے مری کشت بن کو بھرا رکھے
یہ یقین، کہ مجھ پر کہیں گے درکی روز بادل شامی کے
شبِ قمار سے نہ ڈرا مجھے، اے خدا! جہاں دلکشا مجھے
کرتے تھے وہیں ہیں پشہ نری شامی حب و بھال کے
کوئی کوئی ہو کر قیس جو، کوئی میرے ہو کر تدبیر ہو
بھی نام ایک ہی شخص کے بھی بھول ایک ہی ڈال کے

○

نہ وہ رس ہے فرصت عشق کا نہ وہ دن ہیں کشفِ کمال کے
مگر اب بھی دل کو چراں کہیں وہی شجر سے غم و حسنا کے
یہ جو گردِ بادِ حیات ہے، کوئی اس کی زد سے بچ نہیں
گرا آج تک نری باد کوئی رکھوں نہ بھال نہ بھال کے
ہیں دین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جہیں پہ ہیں جو کھٹے ہوئے یہ حساب ہیں مرد سال کے
وہ کبھی شمع کا فوس کہیں، کبھی گل کہیں کبھی نول کہیں
کہ ہیں مہری صبحِ سرورج میں ابھی رنگِ شامِ زوال کے

۱۰۹۷۷۷

جدا
۹۱

جدا
۹۱

چاند پر پہنچا لبیک من خود سے دور رہا
ابھی ادھر بھی ہے انسان کی انگڑائی

سمجھ رکھا ہوں زمیت کا یہ مفہوم ندیم
گر دشمن یہیم ہیں ہے راز تو انائی



گو مجھ سے منسوب تھی انجمن آدائی
اب میں ہوں اور مد نظر کی تنہائی

میں جو کھنڈ تو آئے بھی اس شہر کی
جیسے توڑ ہی لے گی لالہ محمد رانی

میں نے جنوں کا صرف یہ مطلب سمجھا ہے
سودائی کو راس زکائی و انائی

دنیا اور خدا کا رشتہ جانے کون
جس کا تماشا ہے وہ آپ تماشا ئی

۹۲

یاد کے قصر ہیں، امید کی قفسیں ہیں
میں نے آباد کیے درو کے صحرائیکے

اس لیے صوفی قدامت ہے تنہا طبع میرا
میرے بذات کو کبھی کافرشتہ حیات

ذہن میں نشیب و تعالیٰ کے پیکر ہیں
بیت کدے کو وہ بنا لیتا ہے کچھ دیکھ

اس کی قدرت نے مرا راستہ دکھا دیا
چوچہ بچھ سے کہ قیامت، چھوٹی برپا دیکھ

گر ستمد رہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اتر جاتے ہیں دریا دیکھ

خوشی رات نے سوچ سے یہ سرگوشی کی
میں نہ ہوتی تو مرا نور برستا دیکھ

۹۲

○

مٹ کر وہ گایہ اندھیرا میں اکیلا دیکھ
میرے ہمراہ چلے گا مرا سا دیکھ

میری آنکھوں کی چکاچوند بنا سکتی ہے
جس کو دیکھا میں نہ جانتے، اسے دیکھا دیکھ

چاندنی اس سے لپٹ جاتی ہو، میں نہیں
کوئی رہ سکتا ہے، نہیں میں لپھوٹا دیکھ

میں تو اُس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ دے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو دیکھا دیکھ

دو ۴
۹۴

میں تو ہر سانس میں آیا ہوں خدا کے قریب
پھر بھی خدا مجھے نہ جانتا ہے دھوکا کیسے

تہیں ڈوبے مجھے تار سے پوچھے کوئی
موجہ بھرنے کشتی کو اچھلا کیسے

لوگ جو خاک وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

جو مرے دہشتِ شفقت کے ہیں محتاجِ ندم
چھین لیتے ہیں مرے نہ کاغذ لہ کیسے

۱۹۷۷ء

دو ۴
۹۵

○

جب اس کے وجود پر نطسہ کی
تصویر سی کھینچ گئی سحر کی

تم ایک تمازتِ حبیبیں ہو
سرا میں ہو دھوپ دھوپ کی

چاہے وہ ہندو ارمحضر ہو
روشن تو ہے زندگی سحر کی

یاروں کی نطسہ دقفس پر
اور مجھ کو تھک شش بال دپر کی

بستی کو گل گیس اندمید
جب آگ بجلی ہے میرے گھر کی

دوای
۴۲

دوای
۹۶

سوتے رہے۔ شب کو رشتہ والے
بازار بیٹ گئی گجسہ کی

کچھ سے مسقم کبھی نہ نکلے
جاری رہی جنگ خیر و شر کی

دقت آنے لگا، جب نہیں مڑے گا
مرضی نہ ہوئی اگر بشہ کی

آئینے اٹھانے پھر رہے ہو
کچھ منکر کروندیم سر کی

ج. ۱۹۷۷ء

آدمی بھی عجیب چیز ہے

آدمی بھی عجیب چیز ہے !
جو نہیں ہے اسے ڈھونڈتا ہے
مگر جس کو پاتا ہے
اس کو وہ جب تک کہیں کھو نہ دے
کتنے بے چین رہتا ہے !
حاضر کو غائب میں
غائب کو حاضر میں
یوں کھو جتا ہے
کہ جیسے وہ نہ تو کھو گیا ہے !

اپریل ۱۹۷۷ء

ددا
۹۹

ددا
۹۸



(نذاۃال)

برف جب بگھلی

مچھڑا شام میں جب بگھ گئی شفق کی صورت
تو آفتاب پہنیں دی مر سے چراغ کی کو
کسی بھی رات کو میں رات یوں مان رہا
کہ میرے دل کے افق سے تو چھوٹی رہی پور
جنہیں تلاش نہ ہو آخری حقیقت کی
سمجھ نہ پاتیں طلوع و غروب کی تلک و دو
یہ راز مجھ پہ کھلا اس کی حسن کاری سے
کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتو

برف جب بگھلی تو نکلے کوہ پہاڑوں کے جسم
بستیاں جیسے اُبھرتی ہیں سیلابوں کے بعد
جیسے آسید پ حقیقت غلہ کے خوابوں کے بعد

اپریل ۱۹۷۷ء

دوام
۱۰۱

آنے والا زمانہ

میں جو کچھ کہوں گا
وہی آنے والا زمانہ کہے گا
کہ یہ آنے والا زمانہ
میرے ماضی و حال کی نسل ہے۔
فرق اتنا سا ہے
آنے والے زمانے میں
جو کچھ بھی ہوگا
میرے حکم سے
میری تائید سے
اور میری حمایت سے ہوگا

اپریل ۱۹۶۶ء

دوام
۱۰۰

تمام وقت کی پیمائشوں کے سچے ہیں
کہ چاند ایک ہے لیکن ہزار ہا مسرت
صدت سے تو نے گزرتک سفر کیا تو کیا!
گھر کے بطن میں دیکھتا تو نے دانہ بجز
خدا کے نور کو چھو کر یہ سوچتا ہوں ندیم
کہاں کہاں مجھے لائی مرے خیال کی رو

اپریل ۱۹۶۶ء

۱۰۳

۱۰۳

○

یر کیا کہ عشق کروں، پاس آبرو نہ کروں
میں تجھ کو کھوس کے خدا کی بھی جستجو نہ کروں

ابھی چاند نکلا نہیں ہے !

میں انتظارِ طلوعِ سحر میں جیتا ہوں
میں اپنا چاکِ گریباں کبھی فونہ کروں

ابھی چاند نکلا نہیں ہے

گر آسمان کی سیاری پہ جو دھول سی ڈر رہی ہے

ہر اول کروں نے اڑائی ہے

بیشِ نظرِ آسمان کی صفائی ہے !

آھر ہیں چاندنی اپنے نیچے لگائے گی

اور رات کی خلقتیں اس کے پرے پر مامور ہوں گی !

تو صرفِ حرم نہیں ہے درے حرم بھی ہے
میں تجھ کو پاس کے بھی کیوں تیری آرزو نہ کروں

غور ہوں کہ اجارہ پسند ہوں کیا ہوں
میں تجھ کو اپنے خدا کے بھی رد و نہ کروں

یہ شور سے قوم سے ترکِ شعر کے ہیں نیکم

کہ جب بھی شعر کہوں، دل لہو لہو نہ کروں اپریل ۱۹۷۷ء

اپریل ۱۹۷۷ء

دوام
۱۰۴

بگردم

بگردم کے لئے تھے
جب بند کھڑکی کے شیشوں پر دستک ہوئی!
کون ہے؟۔ میں سنہ پوچھا
تو ایک اور دستک ہوئی!
نیند کچی تھی
آنکھوں میں خوابوں کا غم تھا
میں کروٹ بدلنے کو تھا
جب یہ دستک تسلسل سے ہونے لگی!

دوام
۱۰۵

کون گستاخ ہے؟۔ میں سنہ پوچھا
پٹ کر جو دیکھا
تو وہ پھول تھا سیتے کا
جو خوشبو کا تحفہ بیٹے
مسکراتا ہوا
ایک معصوم بچے کی مانند
کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کھڑا تھا!

اپریل ۲۰۰۷ء

دوام
۱۰۶

دوام
۱۰۷

بیٹھ بیٹھا ہے ہا ہوں میں زیرِ عشق مجھے
میں جب بھی فکر کی دھواں سے پھلتا ہوں

زُخوں کے جبر سے آزاد ہو چکا ہوں نہ کم
خزاں میں پھولتا ہوں آندھیاں میں پھلتا ہوں

اپریل ۱۹۷۷ء



برہنہ پائیں سوستے دشتِ دردِ پلٹا ہوں
میں اپنی آگ میں اپنی دنیا سے جلتا ہوں

مرے مزاج کی چادر گری کرے کچھ کون
چمن کی راہ سے، صحرایں جانکتا ہوں

اگر جلانہ سکا مجھ کو آفتاب کوئی
میں رنگِ بو کی نازت میں کیوں گھبتا ہوں

مجھے تو یکسر محسوس سے محبت ہے
میں صرف ایک قصور سے کب جلتا ہوں

دو
۱۰۹

دو
۱۰۸

میں چہرے پر تیرے محبت کی مہرؤں کے نیچے کھلاؤں
تیری جلد کو چوم کر آسنے کی طرح جھگڑاؤں
میں گزرتے ہوئے وقت کو یہ بناؤں
کہ انسان کا عشق لمحوں کا قیدی نہیں ہے !
اگر جسم اس عشق کی ابتدا ہے
تو جو انتہا ہے
وہ ہر سوچ سے ماورا ہے !

اپریل ۱۹۷۷ء

حسن و عشق

تجھے دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ جو وقت تجھ سے بچ کر گزرا
کتنے بے درد تھا !
تیرے چہرے کے نظار میں ہل جلاتا رہا
تیری بکلیں چمکتی ہوئی جلد سے
اپنی مشعل جلاتا رہا
سوچتا ہوں
اگر اب اُسی وقت کا سامنا ہو
تو میں تجھ کو باہوں میں سے لوں

دوام
۱۱۰

دوام
۱۱۱

○

صحنے پڑھ رہا ہوں اونچ نیچ دھسکاڑوں میں
کئی صدیوں کی گونجیں دفن ہیں ان کو سڑوں میں
جنہیں اب دغا ہے دیو فلک ارض مغرب کا
کبھی پیغمبروں کی روشنی تھی ان دیاروں میں
انہی کے مطلعِ غیرت سے کل غور شد اُبھرے گا
جو آبِ ثل ہیں ارضِ ریشا کے بے قراروں میں
زبان کا تھہرنا ہے نہ ان کا پاؤں اٹھتا ہے
مری بے دست پائی کے مگر چپے ہیں یاروں میں

مری نظروں میں یہ آتش فشاں کے دہانے ہیں
جو مہر کے محل اُگنے لگے ہیں سبز زاروں میں
نماز اس قدر ہے دھوپ چھن جاتی ہے تیروں
کہیں سایہ نہیں ملتا درختوں کی قطاروں میں
غبارِ صبح کی ہلکت میسر ہو تو کیسے ہو؟
اذا نہیں سُن کے کھو جاتا ہوں چڑیوں کی کھانوں میں
میں ان لوگوں کو دعوت لے رہا ہوں سیرِ سحر کی
جو کھو بیٹھے ہیں اپنی راہ پھولوں کے حصاروں میں
تدبیر اب تو سمجھ لو بات قدرت کے عہدِ تم کی
ستارے کچھ تو کہتے ہیں اشاروں ہی اشاروں میں

دوام
۱۱۳

دوام
۱۱۳

خلوع

فائرنگ

داست ایسی بھی جاہر نہیں ہے
وہ آئی ہے
لیکن تمہارے لیے
کچھ نہ کچھ ساتھ لائی ہے
اس کے سیر پر رہن پر نہ جاؤ
کہ دایانِ ظلمت میں اس کے
ستارے بھی ہیں
صبرِ فوج کے اشارے بھی ہیں

یہ مانا
کہ تم نے تو گول کی آواز سن کر کہا تھا
کہ گولی چلی ہے
مگر میں
چشتی ہوئی ہدیوں
اور اُٹھتے ہوئے خون کے نشو و نما
گوئی پٹنے کی آواز سنے سے پہلے ہی
اپنی سماعت کی میت کو دھنا چکا تھا

اپریل ۱۹۶۷ء

اپریل ۱۹۶۷ء

دعای
۱۱۴

اگر نہ دردِ مری روح میں اتر جاتا
میں جیسا بے خبر آیا تھا، بے خبر جاتا

ابھی کہیں نہ کہیں صدق بھی ہے، عدل بھی ہے
میں در نہ خیر کے اثبات سے مُکھ جاتا

فضائے تیرہ سے مانوس بنی نگاہِ مری
فلک سے ورنہ میں دُرا نہ کیوں گزر جاتا

کہیں جھٹلاؤں میں آدم کِ لاش کھو جاتی
نہیں پہ آکے اگر زندگی سے ڈر جاتا

دعای
۱۱۵

ہر ایک ڈوبنے والا پر سو جاتا ہے، کہیں
بھنور سے بچ کے نکلتا تو پاؤ اتر جاتا

تمام علمِ مرادِ شت میرے ساتھ رہا
تمام علمِ قسمتِ رہی کہ گھر جاتا

مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیم
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کہہ جاتا

ایک نظارہ

شہراہ حیات پر کھڑا ہوں
اور دیکھا رہا ہوں یہ نظارہ
عورت کو بھٹک کے بازوؤں سے
اک شخص نے کار سے اتارا
عورت نے طویل چیخ ماری
اور کار نے بھلے سیطرہ
اک منہنی چار سو رداں تھی
ٹوٹا ہو فلک سے جیسے تارا

ناگاہ مرے قریب آکر
تو خود میرے وجود سے پکارا۔
کب ہو نا سبہ چار آنسوؤں سے
پورا اک نسل کا خارا
کیا تیرے عمیر میں نہیں ہے
عزیزت کا بچا کھچا شہارہ
اشکوں سے نظام کیسے بنیں
اے شعر و سخن کے بزم آرا!

دوایم
۱۱۸

○

غروب مہر کی کس نے خبر اڑائی ہے
مرے پہاڑ کی چوٹی ابھی حنائی ہے
مجھے مددِ فلک کو عبور کرنے دو
دہاں چلا ہوں جہانِ ذہن کی رسائی ہے
ہے اس کی تردیدیں خلأ اور مادہ رائے خلأ
یہ مشیتِ خاک کہاں خاک ہیں بنائی ہے
مرے خدا نے کیا تھا مجھے ہیرِ بہشت
مرے گزرنے رہائی مجھے دکلائی ہے

دوایم
۱۱۹

پہچاک رہے ہیں شہستانِ شاہ کے گنبد
سپاہِ وقت نے تعزیرِ شب بنائی ہے
اتر سکو تو شعیبِ بیست میں اُتر دو
فرازِ دار پہ جانا تو غور فرمائی ہے
بہت عجیب سی ہے رہروں کی مگرابی
عجیب تر مگر اندازِ رہنمائی ہے
امیر دوست کے ٹھنڈے صدف سے کھلا
کہ اس کا گھر ہی نہیں جہم بھی خللائی ہے
ہے شیخِ شہر کو علامہ و قیس کا جنوں
اگرچہ زہد کی پہچان ہے ریائی ہے
پہنے پہنے سے ہیں کیوں ہونٹ میسے کھینٹوں کے
اگر خدا کے تعزیرت ہیں سب ندائی ہے

دوام
۱۲۱

دوام
۱۲۰

اسے قبول نہ کر پائیں گے مرے نقاد

بہت عجب مرا طرزِ غزلِ سراپا ہے

تدقیق کا اصرارِ صحت ہے اس کا

کہ آسمان نے نہیں سے شکست کھائی ہے

ماضی و حال

صفحہ ۱۹۷

وہ دن بھی عجب بہارِ دن تھے

جب تیرے جمال کی جھلک سے

سرشارِ شبنمیں، خمارِ دن تھے

یہ دن بھی عجب غبارِ دن ہیں

جب تیرے خیال کے جلو میں

دیوارِ شبنمیں، حصارِ دن ہیں

صفحہ ۱۹۷

دہلی
۱۲۲



ہائے کس کی قیمتیں نکلیں ہیں
اتنے سائے ہیں، غنئی قسند ہیں
ظلم و ستم کی جتنی بھی تاویلیں ہیں
بودی منطق سب اور پوچھ دلیلیں ہیں
بحر سب اپنا آپ چھپاتے پھرتے ہیں
بحر انسان، فرشتوں کی تمثیلیں ہیں
کتنی سکون گئی ہے جد و جہد جیات
یا احکام ہیں، یا ان کی تاویلیں ہیں
صل نہ ہوا مغرب کا یہ سفاک تضاد
پاؤں تلے لاشیں، سر پر انجیلیں ہیں

مئی ۱۹۷۰ء

دہلی
۱۲۳

برگ و شجر

پتے کو ہوانے درخت لایا
اور اس نے شجر کا چھوڑ کر ساخنہ
کچھ اور بلند ہونا چاہا
جھونکوں نے جب اس کو گدگدایا
تالی سی بجاکے اڑ گئیں وہ
جب نقطہ اوج چھو کے پٹا
چپکراتا ہوا زہیں پہ آیا
اب ڈھونڈ رہا ہے غارِ نفس میں
اپنے بچھڑے شجر کا سہارا

مئی ۱۹۷۷ء

۳۵۰
۱۲۵

جب بھی سوچوں کہ حقیقت کیا ہے
رقص میں ایک بگڑا دیکھوں

وہ قرائن کی صدا بھی نہ سنیں
اور میں پتھر کو بھی گویا دیکھوں

وہ فقط ہیبتِ صحرانہ دیکھیں
اور میں لاکھ صحرانہ دیکھوں

کیا بناؤں کہ میں کیا کیسا دیکھوں
تجربہ میں تجسیمِ تمست دیکھوں

تیری بیگانہ روی کی سوگند
میں تجھے آج بھی اپنا دیکھوں

جب ترا لمحہ رخصتہ پا آئے
تو مٹا ایک ستارہ دیکھوں

۳۵۰
۱۴۳



اہلِ محفل کا تماس دیکھوں
جس کو دیکھوں اسے تنہا دیکھوں

ہرگز رتے ہوئے پل کے پیچھے
ایک فردا پس فردا دیکھوں

جب بھی دیکھوں کوئی شہناز شہر
وقت کا نقشِ کعبہ پا دیکھوں

تیرے دریا میں سفینہ ڈھونڈوں
کھنڈ دریا سیرِ دریا دیکھوں

دو ۲
۱۲۶

عمر بھر کے سفرِ ظلمت میں
روشنی کا وہی نقطہ دیکھوں

دُور سے میں تری چمکیں گن لوں
پاس جاؤں تو ہیوئی دیکھوں

اب تو اس ابر سے بوندیں برسیں
کب تک اڑتا ہوا سایہ دیکھوں

ساری دنیا کے سینوں میں ندیم
میں تو بس ایک ہی چہرہ دیکھوں

مئی ۱۹۷۷ء

دو ۲
۱۲۷

عقل و عشق

اے اہلِ عشق! عقل سے اس درجہ پرکھوں
جب عشق کا بھی رازِ توانائی عقل ہے
تم اور اہلِ دہندہ میں سرشارِ جستجو
اسرا پر کا نام نہ کی شہدائی عقل ہے
ہے منہا کے عشق تو سچائی سرسبز،
سچائی کے وجود کی نوبتِ آلِ عقل ہے
قیمیرِ شخصیت کے لیے دونوں کھیمب
تہاں عشق، انجمنِ آرائی عقل ہے
تخلیقِ عرش و فرش کی غیبِ عشق تھی
اچھلنے ریزہ ریزہ کی یک جالی عقل ہے

مئی ۱۹۷۷ء

دہم
۱۲۹

انعام سمجھ کے زحمت کھائے
سیکھا یہی زندگی کے فن سے

ترت سے گلاب بن کے پھوٹنا
جو حسن نہ چھپ سکا کنوں سے

دہم
۱۲۸



ہم آٹھ کے کس کی انجمن سے
بیٹھے ہیں وطن میں بے وطن سے

اب عام کر دو جہاں اپنا
سورج کا وجود ہے کرن سے

نغم لاکھ چھپا و فصل گل کو
ورکار اڈ پڑے گین سے

محکم ہی نہیں بدن نہ بولے
آواز رکے نہ پیریزن سے

مئی ۱۹۷۷ء

دوا
۱۳۰

مراطرز مسلمان

میں قرآن پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
مرے ایمان کی فصد ہے مراطرز مسلمان
ہے صدیوں سے میرا سندا فدا پر میرا
مرے اعمال جامد ہیں مرے اقوال طوفانی
ارادے منہل ہیں، آرزوئیں مفصل میری
عدوئے ارتقا ہے میرے روز و شب کی یکسانی
عجب کیا ہے مجھے میرے تقاضے سے کٹا ہے
مرا ذوق خود آرائی، مرا شوق تن آسانی
خدا اس پر بھی ہمارے کیوں، اونی پر مسکراتا ہے
تباہے شب سے جہ چھپتی ہے صبح کی زرافشانی

سج ۱۹۷۷ء

دوا
۱۳۱

برفانی چوٹی پر

برف کے مینار پر بیٹھے ہوئے ہیں رہسما
وہ رہنما دوں میں جاری ہے پگھلنے کا عمل
اس بلندی پر بھی ہیں سورج سے کتنے بے نیاز
ڈالنا ہے برف کے پیکر میں جو سوز حاصل
ان بزرگوں کو یہ منظر کیوں نظر آتا نہیں
ایک سیل آبی میں محصور ہیں و شمت و جمل
کھا گئی جب صوبہ دنیا دوں کی برفانی ملیں
کون ان کو تنہا مٹے آئے گا، جزو دست اجل

سج ۱۹۷۷ء

۴۰
۱۳۲

۴۱
۱۳۲

یہ راہبر

یہ رہبر ہیں کسی کو باخبر جوئے نہیں دیں گے
گزر جانے کی شب، لیکن سحر جوئے نہیں دیں گے
مجھے محبوس رکھیں گے وہ وعدوں کی فیصلوں میں
کسی دیوار میں قہر ہوئے نہیں دیں گے
بچے مامور رکھیں گے وہ بارش کی ٹھاؤں پر
مگر فوجوں سے یہ اسحق ترچہ جوئے نہیں دیں گے
مجھے محصور رکھیں گے عجب برف کے ظلم میں
سفر کرنے نہیں دیں گے، بسر جوئے نہیں دیں گے

وہ بچے سے کام نہیں گے دشت کو گلشن بنانے کا
گواک گل بھی میرے ذریعہ سر جوئے نہیں دیں گے
اگر سوچنے سے آدھے آسمان کی راہ ملے کر لی
تو جیب بھی میرے گھر میں دوپہر جوئے نہیں دیں گے
اگر کچھ اور آگے بڑھ گیا اور اک انسانی
تورنے کو بھی میرا جسد ہوئے نہیں دیں گے
مبارک اس کے ہاتھوں ہی سے مل جانے شفا بھر کو
مرے خالق کو بھی وہ چارہ گر جوئے نہیں دیں گے
بچے تکفیر کی آلودگی سے لاد ڈالیں گے
وہ میری اک دعا بھی کارگر جوئے نہیں دیں گے
زہن کی قوت پر روئیدگی برحق سہی، لیکن
کسی بھی شے کو وہ بار جوئے نہیں دیں گے
نکالیں گے نفس سے طائروں کو، زیر جوئے نہیں دیں گے
مگر جھول میں پیدا ہوا وہ جوئے نہیں دیں گے

دہام
۱۳۵



(نذرِ اقبال)

سورج کو نکلتا ہے، سونکٹے کا دو بار
اب دیکھیے کب ڈوبنا ہے صبح کا آرا
جب ایشیا جاگے گا تو رہنے نہیں رہے گا
اس دھوپ کی نگری پر اندھیرن کا اجارا
مغرب میں جو ڈوبے اسے شرق ہی نکلتے
میں خوب سمجھنا ہوں مشیت کا اشار
پڑھتا ہوں جب اس کو نوشتا کرتا ہوں بیباکی
انسان کا چہرہ ہے کہ مسترآن کا پارا
جس ہاتھ نے تھمائی ہیں آنسو سے پونچھے
پھوٹوں پر اسی ہاتھ نے شعبنم کو اُتارا

دہام
۱۳۴

میں گے قوبر نو لٹھے، مگر جب جی نہ چاہے گا
ہوا کو بھی چمن میں نغمہ گر ہونے نہیں دیں گے
نظر رکھیں گے وہ اہل وطن پر اس مہارت سے
کوئی بھی مسئلہ زیر نظر ہونے نہیں دیں گے
یہ مانا آج ہر انسان کی قوت ہے شعور اس کا
مگر اس رسم کو عام اس قدر سوتے نہیں دیں گے
ندیم اپنے ہنر سے دست کش ہونا ہی بہتر ہے
کہ یہ پتھر مجھے آئے گر ہونے نہیں دیں گے

مئی ۱۹۷۷ء

دوام
۱۳۰۱

دوام
۱۳۰۱

جی ہاں کے قہر پار نہ کر پاؤ تندی میں
ویسے تو سمندر کا بھی ہوتا ہے کنار
اس وقت ضرورت ہے وہ کی اندھا کی
صرف اہل وطن اپنے وطن کا ہیں سہارا
بنت ملی جھوٹوں کو اگر جھوٹ سکے بدلے
یہوں کو سزا میں ہے جس قسم بھی گوارا
یہ کون سا انسان ہے اے عرش نشین
بجلی جو تمھاری ہے تو غریب ہے ہمارا
مستقبل انسان نے اٹھایا کیا ہے
آئندہ سے بے تاج رہے گا ہر دارا

جون ۱۹۷۷ء

○

موت برحق ہے، مگر موت نہ چرچا نہ کریں
آپ انسان کی اقتدار کو رسوا نہ کریں
ہم نے جنت کے خوش فلوں سے دنیا پائی
آسمانوں سے فرشتے ہمیں جھانکا نہ کریں
کرد: حقیقت نے کچھ ایسا مہوت
ٹوک اب جس تصور کا قتلہ نصا نہ کریں
حال دماضی نے ہمیں غم کے سوا کچھ نہ دیا
ذور کیا کام کریں، مگر غم فردا نہ کریں

۱۳۸

رہتاؤں سے بس اتنا ہی ہمیں کہنا ہے
کہ وہ انفاط کے ناموس کو بیچا نہ کریں

ہم نے کس صبر سے ہر جہر سہا ہے، لیکن
اب جو ہم حیج اٹھیں، آپ بھی غصہ نہ کریں

ایک چتون کے بس اک بل سے بکھر جائیں ہم
اور طوفان بھی آجائیں تو توٹنا نہ کریں

اڑ نہ بہنے کہیں یادوں کی نئی دھوپ کے رچ
آپ شہنم کی طرح ذہن پرانہ نہ کریں

کبے پھوٹے ہی پھول کھل اٹھتے ہیں یکدم
ہم تو بے حریفی مدامیں مسرانا نہ کریں

جون ۱۹۷۷ء

۱۳۹

تعارف

ابھی جو ایک بیوی میاں سے گزرا تھا
وہ کتنے سال سے

ہر روز

یہیں اسی لمحے

یہیں سے — ٹھیک اسن موڑ سے گزرتا ہے!

میں کل برائے تعارف جب اس کی سمت گیا

تو وہ یہ کہنا ہوا میرے پاس سے گزرا:

ہے وقت نام مرا

اور گزنا کام مرا!

جون ۱۹۷۷ء

دوم
۱۴۱

دوم
۱۴۱

اُدھر موسم بدلتا ہے
اُدھر کئی تو نہیں کھلتے مگر پتھر، جویں کھٹے پتے لگتے ہیں

اُدھر تپوں پر شبنم آئے ہیں کہ اترتی ہے
اُدھر ٹوٹے ہوئے ذرے کا بھہر
اپنے داستاں میں بیسے شہ رگ زمیں کی
دندان پھر رہا ہے

جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا، صرف اس کے حکم سے ہوگا!

اُدھر کے اور اُدھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے
اور کئی پلنے والی ہے!

جولائی ۲۰۱۹ء

۱۹۶۶ء

اُدھر شرج اُبھرنا ہے
اُدھر شاموں کے سناٹے
شفق میں بھیگ کر
نور و فوا کے منتظر ذہنوں کے صفحوں میں اترتے ہیں

اُدھر مشرق سے سیلاب تجلی جب افق کے ساحلوں کو پھیلا جائے گا
اُدھر مغرب سے تاریکی کے فوارے اُبل کر
مردشتی کی سب لہریں کو چاٹ لیتے ہیں

دوام
۱۴۳

دوام
۱۴۲

لیکن اس کی جمیل سوچوں سے جب شعاعیں ہی پھوٹتی تھیں
تو اس کی آنکھوں میں تارے سے جھلکنا لگتے تھے
اور سارے نقوش یوں جھجکائے لگتے تھے
جیسے سورج کے نورِ باطن سے
کائناتِ حیات نرِ پوشی ہو رہی ہو!

خدا، جو تخلیقِ حق کی انتہا پر قادر ہے
وہ جو اس انتہا پر قادر ہے
وہ جو باطن کا عکس ظاہر پر ڈالتا ہے تو معجزوں کی نمود
ہوتی ہے!

حق کا رازِ لبی ہے
اور حق کا رازِ لبی ہے
حق — اس کی جملہ صفات کا ایک ایسا عنوان ہے

ثبوتِ حق
(منصور ہاشمی کی نظم)

بہت جیس تھی!
مجھے خدا کی قسم، وہ لڑکی بہت جیس تھی!
وہ اپنے باطن کے حق سے اس قدر متور تھی
اتنی روشن تھی
اور پھر اتنی باخبر تھی

کہ اپنے ذہنِ ضمیر کے اس جمال کو
اپنے بیدارے سادے سے بھولے بھالے سے قدیموں کے
سے خال و خدیں چھپاتے رکھتی تھی

دوام
۱۳۵

دوام
۱۳۴

جس کے ایک ایک حرف سے

وہ حسین —

وہ بے حساب مددگار حسین

وہ حسن جذبہ و آرزو کا اک شاہکار لڑاکی

ثبوتِ حق بن کے جہانِ کائناتِ حق!

جوفی ۱۹۷۷ء



دل و جانی بیچ کے احسان اُتارے اس کے
خود کو تاپید کیا، نقشِ اُتارے اس کے

اک شبِ قرب ہوئی یوں مری، باقویٰ پر محیط
جگہ گاہیں مری آنکھوں میں تارے اس کے

فصلِ گل آنے ہی میں عازمِ صحرایوں اگر
مجھ سا وحشی ہی سمجھتا ہے انسانے اس کے

کس قدرِ رماور گیتی ہے کشتادہ آغوش
جستے انسان ہیں سب راجِ دلائے اس کے

دو ۲۱
۱۳۶

وہ تو یکتا ہے، مگر عالم تنہا کی ہیں
میں نے کھبرا کے، کتنی نام پکائے اس کے
میں تو اس عزم سے طے کرتا رہا و شہتِ حیات
اک نیا شہرِ بادل گا کنا بسے اس کے
موت بھی آئے گی اب اس کے حلالے سے بدم
کوہیں زندہ بھی رہا ہوں تو سہاڑے اس کے

جولائی ۱۹۷۷ء

دو ۲۱
۱۳۷

معکوس

سربراہِ دردہ لوگوں کی محفل میں
اک شخص نے
(اپنے جیسے سے جو نیم دیوانہ لگتا تھا
لیکن جو فن کار تھا)
اک عجیب بات کہہ دی !

وہ بولا :

” نہیں، آسمان ہے کئی آسمانوں کا
اور آسمان درحقیقت زمینیں ہیں
جو آسمان لگ رہی ہیں زمین سے !“

یہ ایک بھی سربراہِ دردہ، اصحابِ یوں ڈر کے اُٹھے
کہ جیسے وہ فن کار (جو نیم دیوانہ لگتا تھا)
ان کے سردار پر کھڑا ہو گیا تھا !

جولائی ۱۹۷۷ء

دوام
۱۴۸

دوام
۱۴۹

ایک بیل سے

کھال بہت موٹی ہے تمھاری !

سن سن کرتے کوڑے کھاؤ

کال ہلاتے جاؤ !

درد اگر ہڈی میں آتے

سینگ نہ کام میں لاؤ !

دوم کو کس کس کر خود اپنی چھٹی پہ مارو

ادرنے کوڑے کی موسیقی سنئے گو

مسر نہ پڑاؤ !

کٹہر سے مٹی کھود کھود کر تال ملاؤ !

اور جب ساری کھال اڑ جائے

صرف ذرا سا ڈکڑاؤ

پھر پچکے سے مر جاؤ !

اگست ۱۹۷۷ء

ناممکن

کوئی بھی رات نہ کھانا کے ممکن رات

ہر ایک رات سناڑوں سے چلنی چلنی ہے

اگر کھانا اسے نیکی کی طرف ملے جائے

فروغ و گلشن کی بجائیں چھپے پڑے کوڑے

چک چک کے اسے مار مار کر گتے ہیں

دربارہ و امینی تیرگی ہے شب کا نصیب

وہی بیٹے تو فقط روشنی ہے سرب کا نصیب

جولائی ۱۹۷۷ء

دفعہ
۱۵۰

○

جو حقیقت میں سخن ور ہوگا
وہی اندر سے سنوڑ ہوگا
جس نے مروجی سے بغاوت کی ہے
اس صدف میں کوئی گوہر ہوگا
میں تلمکریب میں ہیں ارض و سما
نئی تحسین کا چپکہ ہوگا
میں نے جب بوند کے درکھول دیے
سمنے ایک سمندر ہوگا
چارہ گر دل پہ رکھے ہاتھ آیا
اسنیں میں کوئی خیر ہوگا

دفعہ
۱۵۱

بحث کرنے کا جب آئے گا مزا
ماسے دا در محشر ہوگا
پھوٹے دشمن پہ زس آتا ہے
اصل دشمن مرا ہمسر ہوگا
مذوق بعد یہ دستک کیسی!
ہو نہ ہو، کوئی گداگر ہوگا
میں بنا جاتا ہوں بوٹی بوٹی
یہ تماشا یونہی دن بھر ہوگا
امن کا عہد تباہی کے کاغذ پر
جب نہ وار انتہا ہوگا

اگست ۱۹۷۷ء

دوام
۱۵۳

ان پر کہ جو شیریں کے گرجے
غرائے، دہاڑے دہاڑے ناسے
اور کھال محل میں مچول آئے

ان پر جو دے جلنے آئے
لیکن جو فریب نور دے کر
ظلمات کا رس پھوڑ لائے

ان پر کہ جو عشق کے ہاسے
شہروں سے نکل کھڑے تھے
اک دستہ کو ہمارا لائے

ان پر کہ جو حفظ فن کی دھن ہیں
فن کو زنجیر کرنے نکلے
تو بند کو اسیر کرنے نکلے

دوام
۱۵۲

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کسان چھپاؤں
جو میرے پیچھے تھے نبیوں ہیں
رہنے کے لیے رکا ہوا ہے

ان پر کہ جو میرے ماہر تھے
اور جن کا کمال پہنچا
جلتے ہوئے گھر، گئے مگر تھے

دوالم
۱۵۴

ان پر کہ جو دیکھتے تھے سب کچھ
پر پیچ بھی سہ نہ کر سکے وہ
جی بھی نہ سکے نہ سر سکے وہ

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کساں چھپاؤں
جو میرے بچنے ہوئے لبوں میں
رہنے کے لیے جڑ کا ہوا ہے

اگست ۱۹۷۷ء

دوالم
۱۵۵

○

مٹے بند بھی کر، ہولی بھری راتوں کے
گنگ ہونے لگے الفاظ منا جاتوں کے
کوئی پل اس کی جھڑکی کا، تہی دست نہ تھا
میں تو انہاں ویسے چھوٹا ہوں سو غاتوں کے
چھت پکیتی ہے تو لگ جاتی ہے یاروں کی فضا
یہنے احسان ہیں دو گونہ ہیں ابرساتوں کے

نہ سہ نہ ہر تو اپنا ہی ہو، پیٹے ہیں
جاہم خالی نہیں رہتے کبھی سقر اطمن کے

میر عشق میں گردشت سسکتے ہیں تہیم

اہل دل کے لیے یہ فرش ہیں باناتوں کے اگست ۱۹۷۷ء

دہلی
۱۵۷

دہلی
۱۵۷

وہ کچھ بھی تھا مگر اس وقت اک وہی تو تھا
 کہ جس نے بُرے کے منقلب دین کو کھولا تھا
 مرا جوان وطن، میرا سب زبان وطن
 رکھا گیا تھا جسے گنگا عیدِ طفلی سے
 پھٹے پھٹے ہٹے زخمی لبوں سے بولا تھا
 یہ اس کے حروف کا اہجاء تھا کہ اس کے طفیل
 وہ لوگ جو کئی نسلوں سے خاک پر سر تھے
 اُٹھے تو سینہ گیتی ہیں اک دھماکا سی اُٹھی
 بہت لطیف اجلے سے شب چمکی اُٹھی
 نہیں کے بھڑکنے کے سنگا درن کے پہلے
 خزان سے رہندی ہوئی دستوں میں ہیں با
 خرام ابراہم لائے بہا بن کے چلے

ایک فرد — ایک تاریخ

وہی ہوا، جو سدا اہلِ دل کے ساتھ ہوا
 کہ بن گیا بدعتِ طعن، اس کا چاکر قبا

وہ کچھ بھی تھا، مگر اسائنِ دلِ مہاں تھا
 صدا کی شاخ پر جب اس کا حرف پھول کھلا
 وہ دشت بھی، کہ جو خیر شے تھی صدیوں سے
 غم کی آنچ جو پہنچی تو سبزہ زار، ٹوٹے
 وہ کوہِ سدا جو تاریخِ بستی کے مہم میں تھے
 جب اس کے لہس سے چٹختے تو گلزارِ شے

۳۳
۱۵۸

۳۳
۱۵۹



(نذر اقبال)

اللہ! قیامت اگر آئی ہے تو مل جائے
پھولی ہے جو برسوں میں واک شاخ کو پہل جائے

مر جانے کوئی گل نہ ستارہ کوئی ٹوٹے
انسانی سنبھل جائے تو کیا کچھ نہ سنبھل جائے

کیوں عشق کی اس تہ سے دل بوم نہ ہو پائیں
پتھر کو بھی جس آنچ پہ رکھو تو پگھل جائے

دشوار ہے انکار کو انکار سمجھنا
انکار سے چہرے کا انکار تک بدل جائے

وہ کچھ بھی تھا مگر اس دور نوکا بانی نہ تھا
کہ جس میں سنگ سیر راہ، باوقار ہوا
وہ ایک فرد جو اٹھا تو ایک فرد نہ تھا
وہ ایک شخص جو برسا تو بے شمار ہوا
فراز عصر سے بھرنا سا ایک پھوٹا ہوا
جو بے حسی کے خم و پیچ سے گزرتا ہوا
دل و دماغ میں اترتا تو بے کسب رہتا

ستمبر ۱۹۷۷ء

دعا
۱۹۱

دعا
۱۹۰

بامعنی

کبھی جب میں زمیں کی رفعتوں سے
آسمان کی پستیوں میں جا اترتا ہوں
تو دن اور رات کی تقسیم
ماہ و سال کی تقویم
اور اسرار کی تفہیم
یوں ایک ایک کر کے میرے کیسے حکمت سے گرتی ہیں
شجر سے بیسے پتے ٹوٹنے لگتے ہیں پتہ جھڑپیں!
اگر میں آسمان پر وہ نہیں ہوں، جو زمیں پر ہوں
تو میں جو کچھ بھی ہوں، اپنی زمیں سے ہوں
اگر انسان ہوں تو اپنی مٹی کے یقین سے ہوں!

ستمبر ۱۹۷۷ء

پنہوں کو تو دور کا رہے آئندہ سحر کا
تبسم کو یہ ڈر ہے کہ کہیں اسے دھن جئے

ہر موڑ پر بیٹھا ہے یہ خوشخوار درندہ
جو لمحہ گزار جائے اسے وقت نکل جائے

چپکے سے ہوا میرے خرابے میں جب آئے
گو ضبط کر کے لاکھ لکھ کر حج نکل جائے

انسان ہے اک جسم کی اک جاں کی شرافت
اور اک جھنس جئے تو دوجان بھی جلی جائے

شاعر کو یہ نہ چاند سے کم کچھ نہیں ملے گا
بہوہوں پر گر لڑک کو دیکھے تو میل جائے

ستمبر ۱۹۷۷ء

۱۱۱
۱۹۳

گھبراہٹوں جب بھی میں گراںباری شب ہے
شرق سے تھکی کا دیرپو سا کھٹلا ہے

نکلے ہوں میں جب جھانک کے آئینہ جانی ہیں
جس شخص کو دیکھا، مجھے اپنا سا لگا ہے

انسان کو انسان سمجھنا بھی تو سیکھو
اچھا ہے سو اچھا ہے برا ہے سو برا ہے

مفہوم میں کچھ فرق ہے، الفاظ وہی ہیں
دیوار پہ لکھا ہوا میں نے بھی پڑھا ہے

یہ عین بیاباں میں شمس میری آنا کا
باہر سے اگر خشک ہے اندر سے ہر اس ہے

گر جبر کرے کوئی تو میں جب سہ سہی کیوں
جو اس کا خدا ہے وہی میرا بھی خدا ہے

۵

مجرم جو صدا کا تھا، وہ زنجیر، پیا ہے
اور خانہ زنجیر کا سہارا ہے خدا ہے

بستی سے گزرتا اسے دشوار ہوا ہے
ہر شخص فقط ایک طرف دیکھ رہا ہے

دیکھا ہے جب آئینہ فتن میں، تو کھٹلا ہے
ہر حسن کو انسان نے تحسین کیا ہے

ساحل کی چٹانوں کے اگر ہز ہیں چہرے
پتھر میں بھی اک سادہ نشو و نما ہے

۱۔ خانہ زنجیر، مجرم جو صدا کا تھا — غایت

دوام
۱۶۳

زندہ ہوں کہ شاید اُسے اس سراسر وفا ہو
حدِ شکر کہ ثقیل مرا ایسے دھنا ہے
راکھ عمر سے میں تیرے تعاقب میں دانی ہوں
اسے وقت تیرے کیسے تقدیر میں کیا ہے

دوام
۱۶۵



(نذرِ اقبال)

ستبر، ۶۱۹۷

کبھی جو حدِ نفرت تک پردن کو پھیلا دوں
میں اپنے آپ میں تحلیل ہونے لگا ہوں
الہی، جب بھی مروں میں تو اس داسے مروں
کرن کی طرح، شکلوں میں فلوڈ کر جباؤں
تو آدمی کا ہے محبوب، اور عظیم و جمیل
میں تھیسوں کا ہوں مسجود، اور خوار و زبور
وہ درد مجھ کو ملا، جس سے جہنم میں بھی
کہوں تو کس سے کہوں اور ہستی تو کیسے سہوں

دو
۱۹۶

تمام حشر ہوں، لیکن سکوں چپے چہرے پر
میں جب بھی آئے دیکھوں، بہت عجیب لگوں
میں وہ ہوا ہوں، گھٹا جس کی ہسفرنہ ہوئی
سوا میں آگ کی مانند جنگلوں میں چلوں
شعاعیں چھنے چلا تھا میں آشیانہ کے بیٹے
فلک کے گنبد بے دریغ پھڑپھڑانا پھروں
خدا نہیں تو کوئی آدمی کہیں مل جائے
میں کیا کروں اگر اتنی بھی آرزو نہ کروں
طنا بے غیر گر دوں ہوں اے فرشتہ موت
میں آسمان کی خاطر زمین میں اتروں
نبیلم جبر ہے یا اختیار ہے میرا
کہ جس کو مرنا ہوا پاؤں اس کو مٹنے دوں
میں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں
میں شمع بن کے بھڑوں آفتاب بن کے جلوں

دو
۱۹۶

شیم گل ہوں تو کوندے کی طرح کیوں پکوں
میں سچ سچ فضا میں حسولی کرتا رہوں
مری فضا میں بقا کے ہزار تیر ہیں
میں عون ہر کے دل کائنات میں دھڑکوں
چراغ آخر شب ہوں، مگر تپتا ہے
مسافروں کو آفتی پر دکھائی دوں تو بھڑوں
میں آدمی ہوں عجیب طرح کا ستارہ مزاج
کہ بار بار سر اورچ آسمان ٹوٹوں
مری اکائی کو جب بھی غنیم ملکا رہے
میں برقی کے گروں میں بگولہ بن کے اٹھوں
مرے وجود کا مفہوم اجتماع میں ہے
خدا کرے کہ میں انسان سے خدا نہ بنوں
دہی جردن کو شنی آن سنی کیے جائے
تمام رات میں سرگوشیاں اُسی کی شنوں

دوام
۱۹۸

ہوا مجھے بھی لگی سبے نئے زمانے کی
کہ میں بھی اپنے گریباں کے چاک خودی لوں
خدا ملا تو ہڑنی جستجو تمام ندیم
سوٹے کیا کہ اب اپنی تلاش میں نکلوں

نویبر ۱۹۷۷ء

دوام
۱۹۹

تغییر

ہمارے یہ روز و شب عجیب ہیں
کہ روز و شب پہ تیرگی کا گمان ہوتا ہے
روز شب تیرہ کے کناروں سے
جانے کتنے ہزار نور شبہ جھانکتے ہیں!
طلوع کے سارے منظر وہی پر
غروب کے سامنے چھا رہے ہیں!
غروب کی سب شکستگی
اک طلوع کے انتظار میں سانس روکے بیٹھی ہے!

دہلی
۱۴۰

دہلی
۱۴۱

ساری تقدیر کو تغیر کا سامنا ہے

تمام اقدار

سب روایات

اپنے سانچوں کو توڑ دینے کے ایک آشوب ستقل ہیں لیر ہیں

اور جتنے انسان زندہ ہیں۔ دم بخود کھڑے ہیں

جو مر چکے ہیں

وہ ریگ زار عدم کے ٹیلوں پر کڑ گئے ہیں

وہ منتظر ہیں

کہ پتھروں سے گلاب پھوٹیں

ہواؤں میں روشنی بنے

بارشوں میں موتی گر بس

خزاں خوشبوئیں لٹائے!

وہ منتظر ہیں

کہ آسمانوں کے درکھیں

آن گزشتہ فرشتے امڈ پڑیں

اور زمین پر سجدہ دینے ہوئے ہی

آسمانوں کو لوٹ جانا ہی بھول جائیں!

تمام موسم بدل رہے ہیں

تمام میاز مٹ رہے ہیں

تمام افکار مغلوب ہیں

جو سربراہ آورہ تھے

وہ سرور گریباں بیٹھے ہیں

اور وہ جو کہ خاک بر سر تھے

اس قدر سر بلند ہیں

جیسے اپنے قدم سے

زمین اور آسمان کی مابین کی مسافت کو ناپتے ہیں!

وہ آہنی در

دوام
۱۴۳

دوام
۱۴۲

یو نصیب تھا فرش و عرش کے درمیان
آخر تکمل رہا ہے !

قدس اور احترام کے مرکزوں سے پرہیز ہوا ہے
خدا سے انسان کا ربط
مسجد سے آگے بڑھ کر
معافیت میں بدل رہا ہے !

○

سمجھتی ہے چاندنی کو روایتِ حجاب کی
یہ روشنی ہے ڈوبے ہوئے آفتاب کی

خوشنوا میرزا رنگ، تغزلِ امیرِ عرف
ہر سپیکرِ جلالِ کولت ہے نقاب کی

سمجھا ہے کون وقت کی رفتار کا مزاج
لمحوں میں کٹ گئیں کئی صدیاں شایب کی

اعجازِ خاک سے ہیں کس درجے خبر
پتھر سے ڈھالتے ہیں جو کیاں گلاب کی

دسمبر ۲۰۱۹ء

دوام
۱۴۴

دوام
۱۴۵

خالی پڑی رہیں گی جسمِ تنم کی وسعتیں
یاد آئے گی نہ حینِ کرم کو حساب کی

افتدائے موت کو بھی ساتھ کر دیا
میں نے تو زندگی ہی فقط انتخاب کی

پوچھا تھا اک سوالِ ازل میں ندیم نے
اب تک اسے طلب ہے خدا سے جواب کی

دسمبر ۱۹۷۷ء



خلقِ تکمیل کی ہے دیوانی
میرا سراپا یہ میری جبرانی

علم نے کربِ اضطراب دیا
کس قدر میرے سکونِ ممتی نادانی

حوصلے اتمان کو چھوڑنے کے
اور میں اپنا آپ زندانی

چاند سے بڑھ کے لطف ہے شاید
چاند پر سے نہیں کی تابانی

دوام
۱۶۶

دوام
۱۶۶

رشتے

نہیں!۔ کوئی رشتہ بھی اس دہر کا۔ بے نہایت نہیں
راک خدا ہے
جو بے ابتدا اور لا انتہا ہے
کسی سے گر اُس کا بھی کوئی محسوس رشتہ نہیں ہے
یہ محسوس رشتے تو جسموں کی حدت سے تخلیق پاتے ہیں
اور وہ جو بے جسم ہے
اس سے رشتہ کوئی کیا نکالے!

ورائے بدن ایک رشتہ وہ ہے
جس میں روحوں کی آپس میں تحلیل ہوتی ہے!

پرچہ کو تو ذکر بہت خوشش ہیں
افغلی افغلی ہوا میں طوفانی

تیز بارش نے چھت پر دستک دی
جب مرے گھر میں بھر گیا پانی

خود پشیمان کے کام آتی ہے
بعد از وقت کی پشیمانی

اس کڑی دھوپ میں بھی جاری ہے
پسند یا دلوں کی شبیم افشانی

جنوری ۲۸ ۲۰۱۹ء

دوام
۱۲۹

اور پہاڑوں نے دیکھا
کہ اُسی پر فقط برکت کی دھجیاں رہ گئیں
اور محبت کا رشتہ نہایت کو پہنچا
کہ اس دھجکا کوئی رشتہ بھی ہو نہ بے نہایت نہیں

جب کہ روزِ ازل سے یہی کچھ ہوا ہے
تو ممکن ہے اب کے بھی ایسا ہی ہو
دھوپ اپنی جنت کے رشتے کا بھیجا کرے
بحر سے برف کی سب نمی چوس لے
جگمگاتے ہوئے شہبازوں پر اٹھا کر اسے
جب پہاڑوں کے نگوں سے گزرے
تو برف اس کی مٹھی سے گاموں کی صورت نکلتے لگے
اور پہاڑوں کی قسمت بد ملنے لگے

دوام
۱۲۸

دینے خدا سے یہ رشتہ تو امکان میں ہے
مگر اس کی روح ضبط اک سمندر ہے !
قطرہ اگر اس میں مل جائے
اپنی انا کھوکے نابود ہو جائے
اور یہ حقیقت تو اہلِ خدا کو بھی معلوم ہوگی
کہ نابود ہونا نہایت ہے
(نابود ہونا نہایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟)

وہی برف -- جو سرویلوں میں پہاڑوں کے سینے سے لگ کر
پڑی سو رہی تھی
کڑی دھوپ سے رشتہ پیدا ہوا تو بچل کر پہاڑوں سے اُتری !
وہ دریاؤں میں دھناتی ہوئی
اک نئے رشتہ کی سرخوشی میں گھلتی چلی، لگناتی ہوئی
بحر سے جانی !

دوام
۱۸۰

۲۵۵
۱۸۱

اک نہایت سے ایک اور رشتہ چلے

دھوپ سے ٹوٹ کر برت کا جیسے پانی سے رشتہ چلا

○

برت پانی میں زندہ ہے

اور دھوپ میں زندہ رہتا ہے پانی

یہ سب اپنی اپنی اکائی کے اوصاف اک دوسرے کی اکائی میں

زندہ ہیں

میں تجھ میں زندہ ہوں

تو مجھ میں زندہ ہے

یوں اک نہایت سے اک بے نہایت کی جانب بگڑے

پھیل جاتے بڑے اندروں کی الگیت سے

ورنہ اس دہر کا کوئی رشتہ بھی ہو اُسے نہایت نہیں

میں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی نظیر

خود اپنے شعر میں تنہا خود اپنے گھر میں فقیر

گمان جلوں کا ہوتا ہے جب بھی چلتا ہے

مرے جلوں میں مری حسرتوں کا حجم غفیر

بکھر گیا ہوں کچھ اس طرح سطح عالم پر

کہ میری خاک ہی ہوتی ہے میری دکن گہر

تمام صحن چین آگ کی لمبیٹ میں ہے

کہ رنگ گل بھی ہوا اس صدی میں آتش گیر

میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح

ابھی وجود ہے میرا فطیل جاں ہی اسیر

۱۸ جولائی ۱۹۶۸ء

۲۰۱۳
۱۸۳

ایک انسان ملا (مضمون پیش کاغذ)

سیر شہر اور حیات — اک عجب انسان ملا

اس کے ظاہر میں جو رعنائیاں تھیں

اس کے دہن اور ضمیر اور محنت کی توانائیاں تھیں

اس کے باتوں میں جو سچائیاں تھیں

ایک سلجھے ہوئے و دراک کی دانائیاں تھیں

اس کے طبع میں جو برنائیاں تھیں

ایک جاگے ہوئے دہان کی ونگڑائیاں تھیں

۲۰۱۳
۱۸۲

کسی سے زیر نہ ہو پائے ٹکروں کے دیار
کہ ملک فوج ہوئے، ہر پوچھے ندی تنہا

میں لٹ فوجاؤں کہ ٹٹنا ہے مقتدر ہونا
مگر یہ سیرا انا شاہ! مگر یہ سیرا امیرا

تمام ذراویہ ذہن کے کشتے ہیں
کہ رخ بدل کے جو دیکھا، بدل گئی تقدیر

بھی تو پھول کھلیں گے خمیر آدم میں
اگر یہ سچ ہے کہ مٹی ہے آدمی کا خمیر

فسادِ خلق کے ڈر سے ندیم اپنی غزل
نہ پڑھ سکا تو وہ دیوار پر ہوئی تحریر

دہم
۱۸۴

دہم
۱۸۵

اس کی آنکھوں میں جو گمراہیاں تھیں
گو سندر کی سی تا حدِ نظر بھلی تنہا یاں لگتی تھیں۔ مگر انہی گمراہیاں تھیں
جیسے اس شخص کی بڑاں سے شناسائیاں تھیں

ایک افسانہ ملا یا کوئی عنوان ملا !
جیسے فطرت کی طرف سے مجھے کچھ اور جیسے جانے کا
ایک فرمان ملا !
سفرِ زمیت کو ایلقان سے طے کرتے چلے جانے کا
مرد سامان ملا !
میر شہزادہ حیات — اک عجیب افسانہ ملا !

مارچ ۱۹۷۸ء

○
جن افساد سے بہت ہوں
برق کے منطقوں میں جلتے ہوں
میرے پرے میں تیرگی کا سلا
چاند ہوں رات کو نکلتا ہوں
کرنا میں نے وقت کو پا بہند
وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں
کب مرا ذوقِ جستجو بدلا !
میں فقط راستہ بدلتا ہوں

دوای
۱۸۷

دوای
۱۸۷

سکتے محکم ہیں درد کے رشتے
شعاع جلتی ہے! میں گھلتا ہوں

قبریں اپنا جسم بوجھ کے تدبیر
نا ابد پھولت ہوں پھلتا ہوں

○

اپریل ۱۹۷۸ء

نہ ٹمکتے حرف ہیں، نہ دو گار لفظ پر اسے ہیں
وہی نظم ہیں میری متاعِ غنیمت سے تجربے میں جو آئے ہیں

مگر سفرِ قزوین کا ہے یہ علمِ حسی طعنہ کا ہے
کہیں چھاؤں قریبِ جمال کی، کہیں فضاؤں عشق کے سائے ہیں

تری ایک جنسِ چشم سے ہوئی فغہ فغہ بصرِ زینیں
ہوئیں غنچہ غنچہ سہا عین! ذرا لب جو تو سنہ پلائے ہیں

تو کیا تو بزمِ خیال سے تھے خدو خال کہاں سگتے
مرے پھول کس نے پلائے ہیں! مرچے چاند کس نے بکھلائے ہیں

دوام
۱۸۹

دوام
۱۸۸



درد کو جب دل شاعر میں زوال آتا ہے
جو بھی شعر آتا ہے، پتھر کی مثال آتا ہے
تیری آنکھوں میں کسی یاد کی کوئی چمکی سی ہے
چاند نکلے تو سمندر پر جیسا حال آتا ہے
اک نظر تو نے جو دکھا تو صدی بیت گئی
مجھ کو بس اتنا حساب مرد و سال آتا ہے
بجلیاں جیسے پگھلتے ہی کہیں کو حب یس
اب کچھ اس طرح خیالی خد و خال آتا ہے

ترا انتظار نہیں رہا، ترا اعتبار نہیں رہا !
مرے اعتماد کی مثال سے یہ ظہور کس نے اُٹائے ہیں

مرے شوق پر یہ گرفت کیوں ملے خدا یا نفی مرثیہ کیوں
یہ وہ نشہ ہے جسے آدمی تجسے آسمان سے لائے ہیں

جو خلا کے جبر میں قید تھا، وہ خلا کے پار گل گویا
جو گرا تھا بام بہشت سے، یہ بھارا اسی نے گرائے ہیں

یہ غزلِ ندم کی ہے مگر ترا لطف عام ہے کس قدر
کہ اسے یقین ہے سرِ ہر ترنے شعر اس نے سنائے ہیں

اپریل ۲۰۱۹ء

دہلی
۱۹۱

دہلی
۱۹۰

اپنے ہی جن سے ہیں لرزہ بر اندام طہور
جو بھی آتا ہے اٹھائے مجھے جال آتا ہے

آنکھیاں میرے چراغوں کے تعاقب میں چلیں
یوں بھی ہے دہرے عمار کو سیلاں آتا ہے

جب بھی تصویر بہاراں میں بھڑی رنگ نشہ خیم
شلاخ سے ٹوٹتے پتوں کا خیال آتا ہے

پر علی ۱۹۵۸ء

فریاد کروں مگر کس آنکھ
جب ساتھ نہ رہ سکے بال آنکھ

آنسو تو میں پی رہا ہوں ہمسکین
منوع کرو نہ پچکیاں آنکھ

گو نجا وہ سکوست پوچھے طے کا
مجھ کو نہ سنائی دی اذان آنکھ

افسان، خدا کی جستجو میں
بھٹکا ہے زمیں سے آسمان آنکھ



دوام
۱۹۳

دوام
۱۹۳



(نزد غائبہ)

ہاتھ میں تیشہ ہے بانسہ کوئی کسیر کا
کم نہیں ہوتا کشتہ در میں بھی جوتی تمبیر کا

چند جھنکاریں ہیں جن کی گونج ہے آفاق گیر
اور کیا سراپا یہ ہوتا حسنا نہ زنجیر کا

دل سے لب تک حوت کمار اسفر برقع میں ہے
شوق حق گوئی کا، لیکن خوف ہے تکفیر کا

بہید یہ مجھ پر کھلا اس شہر عزت مند میں
بے گناہی بھی ہے اک پہلو مری تفسیر کا

پھیلا دیا ایک دام ابہام
پھو فوں نے قفس سے آستان تک

اک اور فلک، میں خلک تھا
پہنچی ہے مری نظر جہاں تک

یہ ضبط نہیں ہے، خود کشی ہے
جوب دل سے نہ اٹھ سکے بھوئی تک

زندہ ہیں ہنر، ہنر و دروں کے
قبروں کے قومت گئے نشان تک

۱۹۴۸ء

دوام
۱۹۵

یہ کیا گونج ہے؟

میں امن رات کی بے ازلی بے ابد خاموشی میں
جو اک گونج سی سن رہا ہوں

یہ کیا گونج ہے؟

کائناتوں کے کس گوشہ بے نہایت سے آئی ہے؟

اس کے تسلسل میں صرٹ ایک ہی لفظ کیوں گونجتا ہے؟

یہ اک لفظ کیا ہے جسے ”کن“ کے بعد اتنی عظمت ملی ہے؟

یہ لفظ اپنی تکمیل کی جستجو میں

کئی سو رگوں کے مقدر پر منڈلا رہا ہے

دوام
۱۹۴

درحقیقت دلی میں گھر کرنا ہے پر بت کا ثنا
تم نے افنا نہ بنا ڈالا ہے جوئے بشر کا

خواب نے کیا تھا کہ ہم انہوں کی زوہیں کرتے تھے
عمر بھر پھر خواب نے کیا خواب کی تعبیر کا

شب تصور نے تری یادوں کی جستجو کی
ایک جھونکے پر بھی دھوکا سا پڑا تصویر کا

ہجرت سے موسوم کر لی اپنی کوتاہی تدبیر
اور بھلا سا نام اس کو دے دیا تقدیر کا

مئی ۱۹۷۸ء

دوام
۱۹۷۷

دوام
۱۹۷۷

یہ کیا اسم ہے جو بھری کائناتوں کو بے اسم کر سنے چلا ہے؟
یہ کیا گونج ہے جو قیامت کے آواز سی ہے؟
یہ چلی کے پاؤں کے چلنے کی مسامت آسمانوں کے اکے دوسرے
کو کھینے کی آواز کیا ہے؟

○

ہر شے اپنی اپنی زبان میں اظہارِ حالات کرے
صبح کو چڑیا چڑیا پڑے شب بھری کی بات کرے

خلاء کی بے انتہائی میں کچھ پس رہا ہے کچھ یں رہا ہے؟
یہ سب کچھ نہیں ہے تو کیا اُن گنت کائناتوں کا خالق خدا
اک نیا تجربہ کر رہا ہے؟

انسان یوں تو نفسِ نفس میں طے پیرِ غلامت کرے
عشق اگر پس جائے لہو میں، کوارِ آبِ حیات کرے

جون ۱۹۷۸ء

کسی وجہ، کسی جذبے سے پیار ہی ہے ثباتِ بیتا
پیار نہ ہو تو اس دنیا میں کرن گزراؤ فات کھے

ایک تجھت سے ڈرتھا، سو اس کو عالمگیرِ کرب
کون ہے لب جو بھرے جہاں میں ہم کو امیرِ فزات کھے

۲۳۲
۱۹۹

۲۳۲
۱۹۸

ہم پیاسوں کی پیاسی نہ دیکھو ہم قول کے سندرہ ہیں
شبِ ظلمت ہیں مگر گزائے اور سحرِ سوغات کرے

گنگہ ہوئیں حرفوں کی زبانیں سنگِ ہنرے لفظوں کے لب
اب تو ہادی خاموشی ہی تریلِ ہدایات کرے

موت کو اپنی نافرمانی میں سے جو فٹ کا نام نہاں
خاکِ محو سے سبزہ پھرتے اور اعلیٰ ثبات کھے

جون ۱۹۷۸ء

○

رات کے ساتھ ہی رخصت ہوا حساب اپنا

اب کے ڈھونڈنا ہے دیدہ بے خواب اپنا

ہم وہ دریا، کہ تجھے پار لگانے کے لیے

قریب سے ہیں پھرتا ہوا گردِ آب اپنا

تو ہر تیرگیوں سے جو نمٹ چلا

جلی گیا آگ میں وپتی دلِ شبِ تاب اپنا

ہستے یہ حنِ نظر، واسطے یہ حسرتِ فی فن

ہم تو بھوکے ہیں مگر کھیت ہے شاداب اپنا

دوام
۲۰۱

معیارِ رہنمائی

اکیشت زور سے عشق کا سودا نہ کیجیے
انسان کے دستار کو رسوا نہ کیجیے
جذبے کا خون، فطرتِ انسان کا خون ہے
ابسا جو جی بھی چاہے تو ایسا نہ کیجیے
سجدہ بھی کیجیے تو بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنی انا کے وزن کو ہلکا نہ کیجیے
آئینہ دیکھنا ہے تو منظرِ ہزار نہیں
صرف ایک اپنا عکس ہی دیکھنا نہ کیجیے

دوام
۲۰۰

عمر بھر ہم نے بسایا اگر آنکھوں سے لہو
مطمئن ہیں کہ وطن تو ہٹوا میرا ب اپنا
ایک دینا لے بیسایا پائیں بھائی سبے بچہ
اس سخاوت میں سمندر ہٹوا پایا ب اپنا

جون ۷۸ ۳۱۹

دو ۲۰۲

دو ۲۰۳

جب تک ہیں غرموں پر تارے رُسکے پڑے
 بادل سے بچوں کا قہقہہ اُڑا رہے
 صبحِ اول کا گھٹاؤں سے رشتہ غلط سی
 لیکن سمندرِ دل پر تو برس رہے
 افسانے حرفِ وصوت کو معنی عطا کیے
 مفہومِ کائنات سے کھیلنا نہ سیکھے
 تندیب کے لباس سے دھوکا نہ کھائیے
 چورہں پہ اپنے لُک کا دروازہ نہ کھلیے
 تلقین کر رہا ہے عزیزوں کو شیخِ مشر
 سب کچھ پہ کوئی تمنا نہ کھلیے

جولائی ۱۹۷۸ء

○

عالمِ جبر میں سوچا ہوں، نہ سونا چاہوں
 میں تری ذات سے ٹپکس نہ ہونا چاہوں
 گل ترے دل میں کھلیں اور مکس باؤی ہیں
 اسی رشتے میں ہر افسانے کو پرونا چاہوں
 کیوں گوارا ہو ترے در میں بھی شکرِ خیر
 تو جو یاد آئے تو تنہا ہی میں ہونا چاہوں
 جتنے کے لیے رہتا ہے بہت نہ درکار
 کھڑکے پایا ہے، پا کر اسے کھونا چاہوں

دو اُم
۲۰۵

دو اُم
۲۰۴

عاس

بھارت بھارت ہے

اور زبان اک برف پارے کی طرح ٹس ہے

مرے تخیل ذائقے میں ریت کے ذرات اڑتے ہیں

سماعت اس قدر بے دست و پا ہے

صرف تنائے کی بہم اور پیہم چرخ اس کی دسترس میں ہے

زمین کو سو گھٹا ہوں تو خاک کی باس آتی ہے

فقط اک جس ابھی زندہ ہے

مستقبل کے لہجے و لہجہ کی جس !

مسلس ارتقا کی جس !

خدا کی جس !

چھار ماہ سے مرے اندر غم انجسٹام کا ابر
خوش بھی ہوتا ہوں تو آنکھوں کو بھگونا چاہوں

میں ہوں اک طرف بھکاری کوئی میری بھی نہ
رات کے فرش پر کرفوں کا بچھونا چاہوں

یوں تو اک پھول کی پتی سے بہل جاتا ہوں
میں کل جاؤں تو صحراناکھسٹونا چاہوں

میرا منصب نہیں پیغمبر فی سبغہ کا
میں تو اس کی کو لفظوں میں ٹھونا چاہوں

اس زمانے کا عجیب طرز تصوف ہے بیدم
کہ میں قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہوں

جولائی ۱۹۷۸ء

جولائی ۱۹۷۸ء

دو ۱۱
۲۰۷

عشق پتھر سے نمی مانگتا ہے
مختل کستی ہے، یہ دانا ئی ہے

بولی سکتے ہیں، مگر سب چپ ہیں
یہ بھی اک طرح کی گویائی ہے

فوکِ خنجر سے سے زحمتِ ندیم
یہ نیا طرزِ مسیحائی ہے

جولائی ۸، ۱۹۶۰

دو ۱۱
۲۰۷

○

یہ جو اک عمر کی تنہائی ہے
میرا معیارِ توانائی ہے

ہر طرے ایک ہی صورت کا، هجوم
یہ عجب و تجسس آرائی ہے

وہی اک چاند، وہی ایکٹ نہیں
نیزی میری یہی بھجائی ہے

شب کو جلتا ہے وہی مثل چراغ
دل کو جو لالہ صحرائی ہے

دوالم
۲۰۹

دوالم
۲۰۸

قرب آؤ تو دیکھوں

قرب آؤ تو دیکھوں
تم مرے معیار کی حد تک جیس ہو
یا پھر اسی معیار سے بھی ماوراء ہو
جیسے انسان کے تصور میں خدا ہو!

جولائی ۱۹۷۸ء

یاد

رات کے وقت مرسے دل پر تری یاد کا لہجہ
اتنی نرمی سے اترتا ہے کہ جیسے شبنم
اک چمکتی ہوئی نورستہ کلی پر اترے

جولائی ۱۹۷۷ء

دو ۱۰

۲۵۵
۲۱۸

بلاوا

بارشوں کے موسم ہیں
بوندیوں کی دستک نے
میرے گھر کے دروازے
مجھ پر کھول ڈالے ہیں

جو ۱۹۷۸ء

○

ریشمی کا، افق شب پر اشارہ کیوں ہے؟
رات آٹمی ہے مگر ساتھ سارا کیوں ہے؟
دہ جو گرو آب سے رزائ نہیں ذرا غور کریں
ہر پہر پھرتے پھرتے دریا کا کنارہ کیوں ہے؟
برف پگھلی ہے تو کیوں اس میں ہے تلوار کی کٹ
دیکھ ٹھنڈی ہے تو پھر اس میں شرارہ کیوں ہے؟
زر محنت جو ہمارا ہے وہ سب کا ہے اگر
قصر مر مر تو تمہارا ہے، تمہارا کیوں ہے؟

دوا
۲۱۲

دائرے

زخم بھر جاتے ہیں
ذہنوں سے اُتر جاتے ہیں
دن گزرنا ہے تو پھر شب بھی گزر جاتی ہے
پھول جس شاخ سے جھڑ جاتے ہیں
مڑ جاتے ہیں

چند ہی روز ہیں
اُس شاخ پہ آئندہ کے پھولوں کے یگانے سے ابھرتے ہیں
تیرے جانے سے مری ذات کے اندر جو غما کو نبھاتا ہے
اک نہ اک دن اسے بھر جانا ہے
اک نہ اک روز سب کچھ
میری پھیلی ہوئی، ترسی ہوئی باہوں میں پلٹ آتا ہے !
جولائی ۱۹۷۸ء

دوا
۲۱۳

راہ گر کوئی نہ سوجھی تھی تو ہم سے کس ت
رہنا ہے ہمیں دور ہے یہ مارا کیوں ہے؟
یہ تصرف ہے تیرا، یا مرا بھرا دست
ترکِ الفت پر بھی تُو آتا ہی پایا کیوں ہے؟
عشق اگر کچھ بھی نہیں جڑ ہوئی، جسمِ ندیم
اس نے المام مرے دلیں اُتار کیوں ہے؟

جولائی ۱۹۷۸ء

دوایم
۲۱۵

لیکن یہ گئے دن کی کمائی ہے
کہ جو بستی زمیں پر حسن تعمیر و تمدن کا غور ملتی
وہ اب تحت انٹری کی سرحدوں کے اس پاکستان
اک غار میں بکھری ہوئی محسوس ہو رہی ہے
اسی باعث میں اپنے شہر کی گمراہیوں میں یوں اُترتا ہوں
کنوئیں میں بیٹھے پیر گر پڑے تو غوطہ خور اُٹھتے !

دوایم
۲۱۳

غوطہ

جولائی ۱۹۷۸ء

قدم گھر سے نکالوں
تو گلی اخنق کی صورت میں نظر آتی ہے !
جب چلتا ہوں
یوں محسوس ہوتا ہے
کہ میں اُتر اُچلا جاتا ہوں !
میرے شہر کو دھرتی کے ماتھے کا اُجالا کہنے والے
جھوٹ کہا کہتے تھے

دہلی
۲۱۶

دہلی
۲۱۷

حضرت خضر کو بھی زحمت خیرِ با ست نہ دو
تن کے جینا ہے تو پھر آبِ بقا مت ڈھونڈو

اپنے ایمان کو آوارہ نہ ہونے دو کبھی !
ایک ل جہائے تو ایک اور ندامت ڈھونڈو

اس سے پوچھو، سفرِ حسنِ شبنم کیسے کرنا
دامنِ صبح میں گل ہائے صبا مت ڈھونڈو

افنی حسن سے اک پل بھی نگاہیں نہ ٹہریں
عشق کو ناسپہ تو کچھ اس کے سوا مت ڈھونڈو

تم جب انسان بنو، تو زمان کی جہالت میں نہ
خیر کے پھول چننا اور خطا مت ڈھونڈو

○

عشقِ بے دم ہے تو فردوسِ وفا مت ڈھونڈو
ریتِ پچانکی ہے تو گدگد کا مزہ است ڈھونڈو

سر سے پائیک ہوں جب آنری ہوئی سر کی تریں
پھر کس ہاتھ پر نیرنگِ حنا مت ڈھونڈو

دھجیاں اپنی حیثیت کی، چھاپے کے کس
سر سے فوجی ہوئی، بیٹی کی ردا مت ڈھونڈو

جہنم کے بوجھ سے دبنا ہے تو روتا ہے ہمیشہ
ہر طرف سے جھڑکتی ہے صدا، مت ڈھونڈو

جولائی ۱۹۷۸ء

۲۱۹

تُو نے کب مجھ کو دے میرے حقوق
میں ترا مندرجہ ادو ایک کرتا

ایک دھنکار تو جھولی میں پڑی
تو نہ ہوتا تو گدا ایک کرتا

جو نہ سمجھا کبھی مفہوم دھن
اپنا وعدہ بھی دھن کیا کرتا

تشنہ بے لگے نگر ڈوب گئے
چشمہ آبِ بخت کیا کرتا

منگست و رنگ کا پیاسا تھا بدم
صرف اک لمس ہوا کیا کرتا

اگست ۱۹۷۸ء

۲۱۸

○

در کسریٰ پر صد کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطف کیا کرتا

بس اندھیرے میں تالے نہ جلتے
ایک مٹی کا دیا کیسا کرتا

دینت بھی ماتھ میں جس کے نہ ٹوکی
وہ تھی دست، دعا کیسا کرتا

ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا کلہ کیسا کرتا

اس کا ہونا ہے مرے پہننے سے
میں نہ ہوتا تو حسد کیا کرتا

دو
۲۲۰

دو
۲۲۱

میں تو سمجھا تھا کہ دن بھر کی رفاقت ہوگی
رات کے ساتھ گیکھا صبح کا تارا میرا

وہ سمندر ہوں جو ملاحوں سے شرمندہ ہے
اتنا گمراہوں کہ پاتال، کمند را میرا

تیرے سینے میں جو آقا تو کمو کیوں نہ بنا
استغاثی لینے چلے ہیں وہ دوبارہ میرا

میں کہ فن کار ہوں کیوں داد نہ دیتا فنی کی
دستِ قاتل نے اگر زحسم سنوارا میرا

ستمبر ۱۹۷۸ء

○

دستِ تقدیر نے یوں فکش اچھا را میرا
میری چلوں پر اتارا ہے ستارا میرا

پیارے دستِ کشتی کا نہیں یاد را میرا
اس کا پیارا ہوں کہ جو شخص ہے پیارا میرا

وہ نہیں ہے تو میری دشتِ فنا کس نے
اس کی آوازیں پھر نام پکارا میرا

راہیں، ماضیوں کی بکریوں کی طرح روٹن ہیں
اس کی یادیں، سفرِ شب میں ہمارا میرا

۲۲۳

جانے ان بے زبانوں نے کہیں قیامت کے آثار فراموش کیا دیئے
شام سے قبل ہی اب پرندوں کے غولی گیشا فونی کو مٹانے لگے

جس نے جس دور میں بھی مسیحائی کی اُس کو مصلوب ہونا پڑا
لوگ گردوی کو زندہ کرانے کے بعد اس کو مقفل میں لانے لگے

۲۲۲

○

ہم کو چاند اور تاروں سے جڑھ کو زیر منظر سمانے لگے
آنسوؤں سے ہونٹھیکا ہوا جس کا چہرہ، دہی مسکرانے لگے

رات بھر ہم نے تیرے کھلے گیسوؤں میں نرمی پانے صومٹ کو ڈھونڈا
صبح کو نیرے جلتے ہی ہر شے، ترے خال و خند جب گمانے لگے

موسم گل جب آیا تو گلزار و صحرا کی ساری تیز آٹھ لگتی
خشک شانوں سے ٹوٹے پتے زرد پتے، دھیس سی بجانے لگے

دن چھپا تو مسافر سحر کے لیے کتنی تاریک صدیوں سے گزرا
ایک سورج کے بعد ایک سورج نکلنے میں کتنے دن گئے

ستمبر ۱۹۸۸ء

دوام
۶۶۵

دوام
۶۶۴

بلوغت کی کہیں

○

دڑے دڑے ہیں جو تابانی جو مسرہ دیکھیں
وہی، افسانہ کو فرشتے کا بھی ہمسرہ دیکھیں
یہ نہ دیکھیں کہ زین خود بھی ہے اک ستیاریہ
لوگ حسرت سے فلک پر مدد و اہمستہ دیکھیں
یہ قلندر ہیں — گز نام یہی کیا رکھا ہے
آؤ، اس دور کے داناؤ سکندر دیکھیں
وہ چوپے جی کو گلہ ہے کہ جلا ڈالے گی
اپنے اندر کے اندھیروں سے نہ باہر دیکھیں

ہیں جھانکتا ہوں جب اُس کی بلوغت آنکھوں میں
بھارتوں پہ صحنے اترنے لگتے ہیں
مری نگاہیں تجھ میں ہو کے اس کے نقوش
لو کی طرح رنگوں سے گزرنے لگتے ہیں
بہت شدید ہے اُس لمحے کی گرفتِ جمال
کہ زخم بھی مرے دل میں سنورنے لگتے ہیں
سندروں کی تنوں سے چھڑا کے وہ چاک
صدی صدی کے سینے ابھرنے لگتے ہیں
چمکنے لگتی ہیں خواب و خیالی کی کہیاں
قریب و دور اسے بکھرنے لگتے ہیں
اکبر خانہ

دوای
۲۲۷

دھند

کمر میں پٹنا سورج نکلا

دشتِ فلک کے ہاتھ میں پیسے طشت پرانا !

چار طوفِ اشجار نہیں، اشجار کے سائے اسنادہ ہیں

ٹانہیں برگ و ثمر سے خالی

ہر نیلی بھی دھندلی دھندلی، کالی کالی !

پھول، سحر کے دھوکے میں انگریزائی کے کرپٹی پتی بکھر گیا ہے !

جڑیا اپنے یون بیری سے نکلی ہے لیکن رستہ بھول گئی ہے !

سڑک پر تانگے کے گھوڑے کی ٹاپیں گولے چھوڑ رہی ہیں !

ایک غبار سے پیچھے والا

دوای
۲۲۶

ذات کو کھو جانے والوں سے شکایت کسی
خود کو جڑو جو ٹنڈ نہ پائیں، ہمیں کیونکر دیکھیں

ہم تو وہ دشتِ نور و انجستہ ہیں ندیم
ایک ہی گل سے دو عالم کو معطر دیکھیں

نمبر ۷۸۹

دوا
۲۲۹

دوا
۲۲۸

بچوں سے محروم گلی ہیں آکر جیسے سوچ رہا ہے
روہوں یا آواز لگاؤں !

چھٹی سے جو دھوئیں کا اک مینار ابھرا تھا
کمر میں جیسے گڑا ہوا ہے !

بچہ ماں سے خد کرنا ہے ۔ صبح کہاں ہے ؟
صبحیں ایسی میٹالی میٹالی کیسے ہو سکتی ہیں !

اک سورج کے ڈھنڈے ہیں نے کتنے مسائل جنم دے ہیں !
جیسے قدرت کا آئین بدلنے لگا ہے !

وقت بھی جیسے پاؤں گھٹ کر چلنے لگا ہے !
روشن چہروں پر بھی دھتے پڑنے لگے ہیں !
پتے پیار کے پیڑوں سے بھی جھرنے لگے ہیں !

نمبر ۱۹۷۸ ع

نہ جانے خال و خد کیوں چھیں گئے ہیں خوش جالوں کے
ہیرے سے نظر آتے ہیں صحر! میں عسکروں کے
اک ایسے دور میں تحسینِ فن کی مجھ کو سو جی ہے
اگر سوچوں تو پر کتنے لگیں میرے خیالوں کے
زمین کے ور پر دستک دوں تو شاید خاک بولی اُسٹے
جو اب آتے نہیں افلاک سے ، میرے سوالوں کے
یہ وقت ایسا ہے جب جذبہ کا سکھیل نہیں سکتا
کہ دیوانے بھی طالب ہیں دلیوں کے ، سوالوں کے

۳۳۰

متفرق اشعار

مجھے نابود ہو جانے سے روکا اس حقیقت نے
زوالوں کے کھنڈر پر قصر اٹھتے ہیں کھالوں کے

ندیم اب ایک قصیدہ اس گروہ صن کا تراں کا
قسانے تو بہت لکھے ہیں تو نے گاؤں والوں کے

نومبر ۱۹۷۷ء

کوئی گلہ نہ کروں گا ترمی رضا کے بغیر
مگر رستے بموں کو کہاں چھپاؤں گا میں
میں ہر کلی کی چٹک ہیں تجھے مدد دی گا
کول کے خاک میں بھی بار بار آؤں گا میں

جس سے پوچھو، یہی کہتا ہے کہ میں زندہ ہوں
وقت کی قبر کا احساس کسی کو بھی نہیں

ناقد نے لغات کھولی لی ہے
یوں قدر ہوئی مرے ہنر کی

۴۵۳
۲۴۲

بحر و صحرا ہوں کہ تیار سے ہوں یا افلاک ہوں
ہر ورق پر ایک ہی اسلوب ہے تحریر کا

جانے، کس کو بس سے قیمتی ہیں زمینیں اپنی
اب تو مسجدوں میں بھی جہلیتیں ہیں جہلیتیں اپنی